

# صِطَّاحَاتِ قُرْآنِ

کے معانی و مطالب کا منفرد و جامع لغت

خواجہ محمد سلیم



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

# اصطلاحاتِ قرآن

( کے معانی و مطالب کا منفرد و جامع لغت )

( خواجہ ) محمد اسلم



فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

© فیروز سنز لاہور

بار اول ..... ۱۹۹۸ء

مرتبہ ..... فیروز سنز لاہور

مجلد ..... 969 0 01421 8

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ ۝

سنو! ہم نے یقیناً قرآن (حکیم) کو (تمہارے سمجھنے کے لیے) آسان

کر دیا ہے؛ پھر ہے کوئی اسے سمجھنے والا؟ (القرآن: ۵: ۱۷)

# اصطلاحات قرآن

قرآن حکیم کے معانی و مطالب کو ان کے صحیح تناظر میں

سمجھنے کا ایک منفرد لغات

(خواجہ) محمد اسلم



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

## فہرست

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۸	اِسْلَام	۹	۱۰	اپنے شاگردِ رشید	۱
۳۰	اَلْاِسْم	۱۰		کے بارے میں	
۳۳	اُسُوۃُ حَسَنَہ	۱۱	۱۳	حرفِ حق	۲
۳۴	اِصْلَاح	۱۲	۱۵	مجھے کہنا ہے کچھ	۳
۳۵	اِعْتِصَامُ بِاللّٰہِ	۱۳		اِصْطِلَاحَاتِ قُرْآنِ	
۳۷	اِکِنَّةٌ (حِجَاب)	۱۴		کے بارے میں۔	
۳۹	اِلٰہ	۱۵	۲۰	اللہ	۴
۴۱	اِمْرَاضِ قَلْب	۱۶	۲۲	آزر	۵
۴۶	اِنْسَان	۱۷	۲۳	آیۃ یا آیت	۶
۴۷	اِنْفَاق	۱۸	۲۴	اِحْسَان	۷
۴۹	اُولُو الْاَلْبَابِ	۱۹	۲۶	اِخْتِیَارِ وَعَمَلِ کِی	۸
۵۰	اُولِیَاءِ	۲۰		آزادی۔	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۷۶	حق	۲۷	۵۲	ایمان	۲۱
۷۸	حقوق العباد	۲۸	۵۳	باطل	۲۲
۸۱	حکمت	۲۹	۵۶	بصارت و بصیرت	۲۳
۸۳	حمد	۳۰	۵۷	تزکیہ	۲۴
۸۵	حیاتِ طیبہ	۳۱	۵۸	تثقل	۲۵
۸۶	الحيوان	۳۲	۶۰	تقوی	۲۶
۸۷	ختم	۳۳	۶۲	تکذیبِ دین	۲۷
۹۰	خشم	۳۴	۶۳	تلاوت	۲۸
۹۲	خلق و امر	۳۵	۶۵	توبہ	۲۹
۹۵	خليفة الارض	۳۶	۶۶	جلال و جمال	۳۰
۹۷	خناس	۳۷	۶۷	جنت	۳۱
۱۰۰	خوف و حزن	۳۸	۶۸	جہاد	۳۲
۱۰۲	دہر	۳۹	۷۰	حُب (یا محبت)	۳۳
۱۰۳	دین	۵۰	۷۲	حدود اللہ	۳۴
۱۰۶	ذکر	۵۱	۷۳	حُسن	۳۵
۱۰۹	ران (زنگ آلودگی)	۵۲	۷۵	حُسن المآب	۳۶



صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۴۰	شِرک	۶۹	۱۱۰	رَبِّ	۵۲
۱۴۲	شہید	۷۰	۱۱۲	رَجِيم	۵۴
۱۴۳	شیطان	۷۱	۱۱۳	الرَّحْمٰن	۵۵
۱۴۶	صالح	۷۲	۱۱۵	رحمت	۵۶
۱۴۸	صبر	۷۳	۱۱۷	الرَّجِيم	۵۷
۱۵۰	صِبْغَةَ اللّٰهِ	۷۴	۱۱۹	رِضْوَان	۵۸
۱۵۱	صدر	۷۵	۱۲۰	زکوٰۃ	۵۹
۱۵۳	صِدِّیق	۷۶	۱۲۲	زین قلب	۶۰
۱۵۴	صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم	۷۷	۱۲۴	سادات و اکابر پرستی	۶۱
۱۵۶	صلوٰۃ	۷۸	۱۲۷	سبحان	۶۲
۱۶۰	طاغوت	۷۹	۱۲۸	سجدہ	۶۳
۱۶۲	طبع (چھاپ)	۸۰	۱۳۱	سحر	۶۴
۱۶۵	ظلم	۸۱	۱۳۴	سریع الحساب	۶۵
۱۶۷	عبادت	۸۲	۱۳۵	سلیم	۶۶
۱۶۸	عدل و احسان	۸۳	۱۳۷	سینۃ	۶۷
۱۶۹	عذاب قبر	۸۴	۱۳۹	شتر	۶۸

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	قانون مجازات	۱۴۰	عذاب النار	۸۵
۱۹۵	قدر (تقدير)	۱۴۱	العفو	۸۶
۱۹۷	قرب الہی	۱۴۲	عمى القلوب	۸۷
۱۹۹	قرۃ العین	۱۴۶	عهد	۸۸
۲۰۰	قرین	۱۴۷	عمر (عظمت و	۸۹
۲۰۱	قساوت	۱۴۸	جہالت)	
۲۰۳	قلب	۱۴۹	غیب	۹۰
۲۰۶	قلب سلیم	۱۸۲	فاسق	۹۱
۲۰۸	قوت	۱۸۲	فحشاء	۹۲
۲۱۰	کفر	۱۸۶	فرعون	۹۳
۲۱۲	کن فی کون	۱۸۷	الفرقان	۹۴
۲۱۵	لعنت	۱۸۹	فساد	۹۵
۲۱۷	مَاعُون	۱۹۱	فلاح	۹۶
۲۱۹	منتقى	۱۹۲	فوز عظیم	۹۷
۲۲۲	محکّمات و متشابہات	۱۹۳	قارون	۹۸
۲۲۵	مخلص	۱۹۴	قانون مکافات عمل یا	۹۹

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۳۹	نور	۱۲۳	۲۲۶	معروف	۱۱۵
۲۴۲	بامان	۱۲۴	۲۲۷	مقام محمود	۱۱۶
۲۴۳	صُوبِ آدَمَ	۱۲۵	۲۲۸	مُتَنَفِقٌ	۱۱۷
۲۴۵	ہدایت	۱۲۶	۲۳۰	مُنْكَرٌ	۱۱۸
۲۴۶	هُوَ	۱۲۷	۲۳۱	مُؤْمِنٌ	۱۱۹
۲۴۷	یقین	۱۲۸	۲۳۲	مِیثَاقٌ	۱۲۰
۲۴۹	یوم	۱۲۹	۲۳۳	نِفَاقٌ	۱۲۱
۲۵۲	یوم الدین	۱۳۰	۲۳۶	نَفْسٌ	۱۲۲

## اپنے شاگردِ رشید کے بارے میں

وہ مردِ خود ساختہ زندگی کے متعدد صبر آزمائشیب و فراز سے گزرا تھا، لیکن وہ رہینِ حرمان و یاس نہ ہوا کہ اس کے دل میں توکل علی اللہ کی شمع فروزاں رہی۔ یہ ادا دوست کو خوش آتی۔ اس نے نانِ جوہیں کو ترسنے والے اس مردِ جوان ہمت میں پہلے ایک بار صنعتی کارخانہ لگانے کا داعیہ پیدا کیا اور ضروری سرمایہ اور ٹیکنالوجی کا بندوبست کیا، ساتھ ہی اُسے قرآن آشنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس مردِ جوان ہمت کا نام خواجہ محمد اسلم ہے۔ جنتِ ارضی، یعنی اشجار سے معمور باغ میں حُسنِ اتفاق سے میرے ساتھ اُن کی ملاقات ہوئی۔ مالی بُحرانوں نے خواجہ کے دل کو گداز کر دیا تھا۔ ایسے دل میں سُخنِ حق سے کبھی ایسا لمحہ آجاتا ہے کہ اس کی کایا پلٹ کر دیتی ہے۔ ایسے لمحے کے لیے میں نے جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے (Psycho-Aesthetic Moment) کی تعبیر اختیار کی ہے۔

میری صحبت میں خواجہ محمد اسلم کو جب اس حقیقت کا یقین ہوا کہ

۵۔ من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن! تو انہوں نے من کی دولت، جسے میں جمالیاتی ثروت (Aesthetic riches) سے تعبیر کرتا ہوں، حاصل کرنے کی خاطر میرا تلمیذ بننے کی درخواست کی۔ میں نے انہیں مخلص تلمیذ القرآن بنانے اور قرآن مجید کے قوانین و احکام اور تعلیمات و ہدایات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی، انہیں اس کے ترجمہ و تفسیر سکھانے کی طرف خصوصی توجہ دی، جس کا سلسلہ ”دوست“ کے فضل و کرم سے جاری ہے۔ میری تعلیم و تدریس سے جب خواجہ محمد اسلم کو اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کے مفردات و اصطلاحات کے معانی و مطالب میں فرق کرنا ناگزیر ہے تو انہوں نے میری نگرانی میں اصطلاحاتِ قرآن مرتب کرنا شروع کیا، اور از بس ذہنی کاوشوں، شوق فراواں اور فضل ”دوست“ کی بدولت یہ مفرد و بصیرت افروز کارنامہ سرانجام دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے لیے وہ بجا طور پر تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔

۶۔ اللہ کرے ذوقِ رقم اور زیادہ!

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر  
ایم۔ اے۔ ڈی۔ لیٹ  
سابق وائس چانسلر، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

# شاہدہ نگہت

کے نام

جس نے جانِ تمنا بن کر مجھے لذتِ حیات سے آشنا کیا،  
میرے نفرت آشنا دل کو خلوص و محبت سے معمور کیا اور  
زندگی کے ہر نشیب و فراز میں ایک وفا شعار رفیقہ حیات  
اور ”دوست“ بن کر میرا ساتھ دیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

## حرفِ حق

حرفِ حق یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ناگزیر ہے کہ قرآنِ حکیم اپنے الفاظ کو موقع و محل کے مطابق کبھی لغوی اور کبھی اصطلاحی معانی میں استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، وہ جنت کو کبھی باغِ دنیا کے معنی میں اور کبھی باغِ بہشت، یعنی جنتِ پُورۃ العین کے معنی میں استعمال کرتا ہے جس کے متعلق اس نے واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ کوئی مُتَنَفِّسُ اس کی ماہیت و حقیقت کا علم نہیں رکھتا (السجده ۳۲: ۱۷)، لیکن اکثر مفسرین نے جنت کے لغوی و اصطلاحی معانی میں امتیاز نہ کرنے کے سبب جنتِ ارضی کو جنتِ سماوی سمجھ کر ایسی ایسی تاویل کی ہے کہ جس سے تکذیبِ قرآن لازم آتی ہے۔

اسی طرح قرآنِ حکیم نے ”رَبِّ“، ”حَسَنَ“، ”سَیِّئَ“، ”صَلٰوۃ“، ”تَقْوٰی“، وغیرہ وغیرہ بیسیوں الفاظ کو اقتضائے موقع و محل کے مطابق کبھی لغوی اور کبھی اصطلاحی معانی میں استعمال کیا ہے، لہذا ان سے

وہی معنی و مفہوم لینا ناگزیر ہے۔ اس اصلِ عظیم کے پیشِ نظر میرے شاگردِ رشید خواجہ محمد اسلم نے ایک مُخلص تلمیذِ القرآن کی طرح قرآنِ حکیم کی اہم اصطلاحات کی، قرآنِ حکیم کی اپنی تفسیر کی روشنی میں، بڑی خوبی سے تشریح کی ہے۔

چنانچہ خواجہ محمد اسلم کی اس علمِ افزا و بصیرت افروز تالیف اصطلاحاتِ قرآن کو کلیدِ لغاتِ قرآن کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ لہذا قرآنِ حکیم کو اس کے صحیح تناظر میں جامع طور پر سمجھنے کے لیے اس کی اصطلاحی تشریحات کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

اس کتاب کی از بس اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر اس کا ہر گھرانے اور کُتب خانے میں ہونا لازم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ

ۛ ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تانه بخشد خدائے بخشندہ!

(ڈاکٹر) نصیر احمد ناصر



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مجھے کہنا ہے کچھ

”اصطلاحاتِ قرآن“ کے بارے میں

یہ میرا حاصلِ مُطالعةٴ قرآن بھی ہے اور مُشاہدہ بھی کہ قرآن حکیم کے معنی و مفہوم کو صحیح و جامع طور پر سمجھنے کے لیے اُس کے الفاظ و اصطلاحات میں معنوی فرق کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ یہ فرق ملحوظِ خاطر نہ رکھا جائے تو انسان ذہنی التباس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس واقعیت پر قرآن حکیم کے اکثر تراجم و تفاسیر شاہد ہیں۔ مثال کے طور پر، جنت کے لغوی معنی ”باغ“ کے ہیں، لیکن قرآن مجید نے بمقتضائے بلاغت جنت کو اُس کے لغوی معنی باغِ دُنیا میں بھی استعمال کیا ہے اور اپنے اصطلاحی مفہوم، اُن دیکھی جنتِ سماوی میں بھی۔

جنتِ لغوی معنی میں :

★ **وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ**

**أَعْنَابٍ (الکہف ۱۸: ۳۲) :**

ان کو دو اشخاص کی مثال سنا دو۔ ان دونوں میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنا دیے تھے۔

★ کَلْتَا الْجَنَّتَيْنِ أَنْتَ أَكْلَهُمَا (الکھف ۱۸: ۳۳):

دونوں باغ اپنا اپنا پھل لاتے تھے۔

★ جَنَّاتٍ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ (سبا ۳۲: ۱۵):

(قوم سبا کے لیے) دائیں اور بائیں دو باغ تھے۔

(نیز جنت دنیا کے لیے دیکھیے الکھف ۱۸: ۳۵،

۳۹ اور ۴۰)۔

بعینہ درج ذیل آیات میں ”جنت“ سے مراد ارضی باغِ ثمرور ہے:

★ وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرة ۲: ۳۵):

اور ہم نے حکم دیا: ”اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ اس (ثمرور اور گھنے) باغ میں جا رہو۔“

★ يٰبَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمُ

مِّنَ الْجَنَّةِ (الاعراف، ۲۷: ۲۷):

اے آدم کی اولاد! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں بہکا وادے

جیسے اُس نے تمہارے آباء و اجداد کو بہکا وادے کر ثمرور

باغ سے نکلوا دیا تھا (نیز دیکھیے الاعراف، ۱۹: ۱۹ اور ۲۲)۔

اس معنی کی صحت کے ثبوت میں درج ذیل نص قرآنی

اور مستند حدیث بصیرتِ افرودز پیش کی جاتی ہے جو اس کی تفسیر ہے:

★ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً مَّا  
بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجدة ۳۲: ۱۷):

دیکھو! کوئی متنفّس (چاہے انسان ہو یا جن یا فرشتہ و روح) اس کا علم نہیں رکھتا کہ اُن کے اعمالِ صالحہ کے اجر میں کون سی چیز جو اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی جنتِ قُرَّةِ أَعْيُنِ) ہے، اُن کے لیے اُن (کے سمعی و بصری مشاہدے) سے چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔

اب اس آیتِ کریمہ کی تفسیر مہبطِ قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنئے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
قَالَ اللَّهُ تَعَالَى أَعَدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَا لَا أَعْيُنٌ  
رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ  
وَاقْرءُوا إِنَّ شَيْئَكُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ

لَهُمْ مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي الشُّكُوَّةِ، ج ۵۳۷):

حضرت ابو ہریرہ <sup>رضی</sup> کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے ایسی چیز تیار کی ہے، جس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ اس کی حقیقت کو کسی کان

نے سنا اور نہ کسی بشر کے قلب کو اس کی حقیقت کا گمان  
 بہک ہوا۔ اگر تم اس کی تصدیق چاہو تو یہ نصِ قرآنی پڑھو:  
 ”کوئی مُتَنَفِّس نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک  
 کی کیا چیز (= جنت) چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔“

(السجدة ۳۲: ۱۷)۔

اسلاف و سادات پرست مُتَرَجِمین و مُفَسِّرین کے، اس  
 نصِ قرآنی اور اس کی تفسیری حدیثِ مبارکہ کی موجودگی میں، آدم  
 اور اس کی زوجہ سے متعلق آیات میں لفظ ”جنت“ کو اُس کے  
 مفہوم جنتِ ارضی سمجھنے کے بجائے جنتِ سماوی سمجھنے کی وجہ حقیقی  
 یہ ہے کہ انھوں نے نہ تو قرآنِ حکیم کے اُسلوبِ بیان کو سمجھا اور نہ  
 اُس کی اصطلاحات اور الفاظ کے معانی میں فرق ہی کیا۔ اس فرق کی  
 غیر معمولی اہمیت و افادیت کی صداقت کا تقاضا یہ کتاب لکھنے کا  
 محرک و عامل ہے۔

اہلِ علم و دانش اس واقعیت سے آگاہی رکھتے ہیں کہ جب  
 کسی حکیم یا فلسفی کے افکار کسی لفظ کی تنگنا میں سما نہیں سکتے تو وہ اُسے  
 اپنے افکار کی معنویت سے مُزین کر دیتا ہے، اور پھر اُس کی  
 صراحت بھی کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ مُصطلحات پیش کی  
 جاتی ہیں: علامہ اقبالؒ کی ”خودی“، افلاطون کے ”اعیانِ ثابِتہ“،

عبدالکریم الجلی کا "مردِ کامل"، شوپہار کا "ارادہ" (Will) "ہیکل کا التقصیر" (Idea)، الکندی کا "وجود" اور ابن عربی کا "وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود"

وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے، اُس نے بھی اپنے مفردات کی لغوی تنگنا کو اپنے اصطلاحی مفہوم میں وسیع کرنے کی خاطر ایجازِ بلاغت سے اپنے اعجازی تفسیری اسلوب میں بیان کیا ہے، جس کی ترجمان زیرِ نظر تالیف "اصطلاحاتِ قرآن" ہے۔

یہ اصل یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح حکماء و فلاسفہ کی تحریروں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اُن کی اصطلاحات کے وہی معنی و مفہوم لینا لازم ہے جو انہوں نے متعین کیے ہیں، اسی طرح قرآن حکیم کی آیات کے جامع اور صحیح ادراک کے لیے اُس کی اصطلاحات سے وہی معنی و مفہوم لینا ناگزیر ہے، جس کی صراحت اُس نے خود کر دی ہے۔

(خواجہ) محمد اسلم

۱۲۶ ڈبلیو، ایل سی سی ایچ ایس (ڈیفنس) فیزس، لاہور کینٹ۔

فون: 5898937/5740481

یکم جون ۱۹۹۷ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

## اللہ :

یہ اسم ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرح اُس کا اسم بھی یکتا و واحد، بے مثل و منفرد اور جامع ہے۔ یہ کسی مادے سے مشتق نہیں اور نہ ہی اس سے کوئی لفظ نکلا ہے۔ اس لفظ کی جمع نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی تانیث ہے۔ اُس کی ذات کی طرح اُس کا نام بھی منفرد ہے۔

”اللہ“ کے معنی ہیں : تمام صفاتِ حسنہ کا مالک و سرچشمہ۔  
قرآن مجید نے اس کے معنوں کی خود ہی صراحت کر دی ہے :  
★ قُلْ اَدْعُوا اللّٰهَ اَوْ اَدْعُوا الرَّحْمٰنَ ۗ اَیَّٰمَآ تَدْعُوۡا فَلَہُ الۡاَسْمَآءُ  
الْحُسْنٰی (اسراء : ۱۰۷ : ۱۱۰) :

(اے میرے پیغمبر!) ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ تمام حسین نام یا صفات صرف اُسی کے لیے ہیں۔  
اللہ تعالیٰ بنی نوعِ انسان کا الہ ہے، یعنی ان کا معبود و محبوب اور حاکم و مطاع ہے (الناس ۱۱۴ : ۳)؛ لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ لفظ ”اللہ“ ”الہ“ سے مشتق ہے۔ علاوہ بریں، اللہ تعالیٰ کل مخلوقات کا

خالق اور ربِّ رحمن و رحیم ہے؛ نیز وہ یکتا و واحد ہے اور کوئی شے بھی اس کے مثل نہیں (الاخلاص ۱۱۲: ۱، الشوریٰ ۲۲: ۱۱)۔

**عقیدہ توحید** : اللہ تعالیٰ کی اُلُوہیت و ربوبیت کی صفات

حسنہ پر بلا شرکتِ غیرے ایمان لانے کو توحید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

توحید اُلُوہیت و ربوبیت پر ایمان لانے یا اُسے تسلیم بالیقین کرنے

والے کو مَوْحِد اور اس کے مُنکِر کو مُشْرک کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بہینال اور اس کی صفاتِ حسنہ، بالخصوص

اُلُوہیت و ربوبیت کی صفات میں کسی غیر یا غیروں کو شریک یا

سہم سمجھنا، یا اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی اور تخلیقی فعلیت میں ان کو

اس کا معاون سمجھنا شرک ہے، جو ناقابلِ معافی ظلمِ عظیم ہے۔

یہ حقیقت ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ عقیدہ توحید

دین کی بنیاد ہے، نیز یہ اللہ تعالیٰ کے قوانین و احکام اور تعلیمات کا

محور بھی ہے۔ بخلاف اس کے، شرک دین یا اللہ تعالیٰ کے نظام

حیاتِ کُلِّی کی بیخ کنی کرتا ہے۔



## آزر

یہ قرآن کی تلمیح (Historical Symbol) ہے، جس کی مختصر التشریح کی جاتی ہے :

یہ علامت ہے مذہبی پیشواؤں، علماءِ سوء، مشائخ اور پیرانِ سالوس وغیرہ وغیرہ کی۔ یہ مُشرک، یعنی سادات و اکابر پرست اور فرقہ پرست مذہبی پیشوا ہوتے ہیں اور لوگوں کو بھی ایسا بنانے میں مصروف رہتے ہیں، نیز ان کا کام تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل سے لوگوں کو توجید کی راہِ مُستقیم سے روکنا اور گمراہ کرنا اور باطل طریقوں سے لوگوں سے مال ہتھیانا ہے۔

یہ فرعونی حکومت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔



183733 / 43233



## آیہ یا آیت

آیت ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو کسی چھپی ہوئی چیز کی نشاندہی کرے۔ ابن فارس نے اس کے معنی 'ٹھیر کر غور و فکر کرنا کے بھی کیے ہیں (المجمل)۔

آیہ کی جمع آیات آتی ہے۔ آیات کے معنی ہیں: رہنما نشانات، جن میں غور و فکر کرنے سے اہل فکر و نظر کسی تاریخی واقعہ، جغرافیائی تغیر و تبدل، طبیعی و سیاسی انقلابات وغیرہ وغیرہ کے عوامل و محرکات اور نتائج و عواقب کا ادراک کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں، آیات کے مشاہدے سے ہم اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی، تخلیقی فعلیت کی وجہ حقیقی اور اس کے قوانین و احکام کی علتِ غائی سے آگہی حاصل کر سکتے ہیں:

★ **إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ** (النحل: ۱۶: ۱۱):

غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں عبرت افروز نشانی ہے۔  
قرآن حکیم کے ہر جملے کو آیت سے اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس میں غور و فکر کرنے سے اصل مقصود کو پایا جاسکتا ہے۔

قرآن حکیم کی اصطلاح میں آیت کا مطلب اللہ تعالیٰ کا قانون، حکم، تعلیم اور ہدایت بھی ہے۔

## إِحْسَان

یہ قرآن حکیم کی از بس اہم اصطلاح ہے۔ اس کے معنی ہیں :  
دوسروں کے ساتھ کُشادہ دلی و حُسن نیت کے ساتھ ایسا اور اس طرح  
مالی تعاون اور حُسن سلوک کرنا کہ وہ خوش ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں  
میں، اہل احتیاج کی آبرو مندانه طریقے سے مالی امداد کرنا اور ان کی  
زندگیوں کو حسین و طیب بنانے کی کوشش کرنا، احسان ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے ہر شخص پر اپنی مالی حیثیت کے مطابق

اہل احتیاج سے احسان کرنا فرض ہے :

★ ﴿أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ (القصص ۲۸: ۷۷) :

تم دوسروں کے ساتھ اسی طرح احسان کرو یا احسن طریقے سے  
مالی تعاون کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

★ ﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَ

بِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ

وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ

أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۝

(النساء ۴: ۳۶) : دیکھو! صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، یعنی صرف اس کے قوانین، احکام اور تعلیمات کے مطابق عمل یا زندگی کرو، اور اس کی ذات، صفات، فرماں روائی اور تخلیقی فعلیت میں کسی اور کو اس کا سہیم و معاون نہ ٹھہراؤ! اور ماں باپ کے ساتھ حسین طریقے سے مالی تعاون اور حُسن سلوک کرو، نیز اعزہ و اقارب سے، یتیموں یعنی بے یار و مددگار چھوٹے بڑوں سے، اہل احتیاج سے، قریبی ہمسایوں سے اور اجنبی ہمسایوں سے اور ضرورت مند رہگیروں سے اور اپنے زیر دست مُلازموں وغیرہ وغیرہ سے بھی آبرو مندانہ طریقے سے مالی تعاون اور حُسن سلوک کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو متکبر و مغرور اور شیخی خورا ہو۔

**عدل و احسان** : احسان جب عدل کے ساتھ آئے تو اس کے معانی ہوتے ہیں: کسی کے حق سے اُسے ازراہ تَلَطُّف زیادہ دینا، اور عدل کے معنی ہیں: کسی کا حق اُسے پورا پورا دینا۔

یہی مطلب ہے اس آیہ جمیلہ کا :

★ **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ** (النحل ۱۶: ۹۰) : غور سے سُنو! اللہ تعالیٰ سب کا حق پورا پورا دینے، بلکہ (ازراہ تَلَطُّف) حق سے زیادہ دینے کا حکم دیتا ہے۔

## اختیار و عمل کی آزادی

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسان کو فکر و عمل اور انتخاب کی آزادی امانت کے طور پر ودیعت کی ہے :

★ اِنَّا عَرَضْنَا الْاِمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ  
فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ

(الاحزاب ۳۳: ۷۲) :

ہم نے (آزادی فکر و عمل کی) امانت کو آسمانوں، زمین، پہاڑوں، الغرض بڑی اور چھوٹی مخلوقات کو دینے کی پیشکش کی، مگر سب نے یہ (بار) امانت اٹھانے سے معذرت کر لی، کیونکہ وہ اس سے خوف بداماں ہو گئے، لیکن انسان نے اسے (جسارت کر کے) اٹھالیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو چونکہ آزادی فکر و عمل، اس کی اپنی رضا و رغبت کی بناء پر، امانت کے طور پر، ودیعت کی ہے، اس لیے وہ اس کے صحیح یا غلط استعمال کے نتائج و عواقب کا خود ذمے دار ہے۔ دوسرے، اس آزادی کی بناء پر یہ دنیا اس کی امتحان گاہ بھی ہے اور تربیت گاہ بھی، اور وہ رہیں امتحان ہے۔

یہ یاد رہے کہ انسان کی "آزادی" کی نوعیت مُطلق نہیں ہے، بلکہ قوانینِ الہیہ سے مشروط ہے، اس لیے اضافی ہے۔ اس سے نظریہ جبر کی نفی ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے کہ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

مؤمن فقط احکامِ الہی کا ہے پابند!



# اسلام

اس سے مراد "دین اسلام" ہے؛ اور دین کا مطلب انفرادی۔ اجتماعی، مادی۔ معنوی اور دنیوی۔ آخروی زندگی کا نظام الہی ہے، جو امن و سلامتی کا نظام (System) ہے۔ اس نظام میں جو داخل ہو جاتا ہے، اسے امن و سلامتی کی حیاتِ طیبہ بسر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَرَضِيتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۵: ۳) :

اور (اے بنی نوعِ انسان!) میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین (نظامِ حیاتِ کُلّی) کے طور پر پسند کر لیا ہے۔

★ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۳: ۱۹) :

بلاشبہ الدین (کُلّ حیاتِ انسانی کا نظام) اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ (حدیثِ نبوی) : دینِ اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے

(بخاری، باب العلم ص ۳۹)۔

نظامِ اسلام چونکہ حق ہے، لہذا وہ دیگر تمام باطل نظاموں پر غالب آکر رہے گا۔

★ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (التوبة ۹: ۳۳) :  
 تاکہ اللہ اُسے کل ادیان پر غالب کر دے۔



# الْأَسْمُ

اس اصطلاح کا مطلب ہے :  
کسی چیز کی علامت جس سے اس کے خواص و صفات کی  
پہچان ہو جائے۔

قرآن حکیم کی یہ آیت انتہائی فکر انگیز و معنی خیز ہے :

★ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرة ۲: ۳۱):

اور اُس (اللہ) نے آدم، یعنی انسان کو تمام چیزوں کے خواص و  
اوصاف کا علم دیا اور ان کو موسوم کرنے کا ہنر سکھایا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اشیائے

کائنات کے خواص و صفات کا علم اور اس کے ساتھ اس کی

مناسبت سے اُن کے نام رکھنے کی استعداد بھی ودیعت کر دی

ہے۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ علم دراصل مادی اشیاء کی

ماہیت و حقیقت اور ان کے خواص و صفات کے ادراک اور

ان کے مطابق ان کے نام رکھنے کی استعداد و صلاحیت سے

عبارت ہے۔

خليفة الارض ہونے کی حیثیت سے انسان کی ایک ذمہ داری



یہ بھی ہے کہ وہ اشیاء کے خواص و صفات معلوم کر کے ان کے صحیح نام رکھے۔ اس کو تسمیہ بالحق سے تعبیر کر سکتے ہیں، برخلاف اس کے کسی چیز یا ہستی کو ان صفات سے موصوف کیا جائے جو اس میں نہ ہوں تو اسے تسمیہ بالباطل کہیں گے۔

اسم کی دو بڑی قسمیں ہیں: اسم بامستیٰ اور اسم بے مستیٰ۔  
اسم بامستیٰ کی احسن و اکمل مثال اللہ تعالیٰ کا اسم ذات اور ان کے دیگر ان گنت اسمائے حسنیٰ ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

★ قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ دَعُوا الرَّحْمَنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ

الْحُسْنَىٰ (الاسراء: ۱۰۷: ۱۱۰):

(میرے نبی!) ان سے کہہ دیجیے کہ اُسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر، جس حسین نام سے چاہو پکار سکتے ہو، کیونکہ کل حسین نام یا صفات اسی کے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام حسین اسماء یا صفات کا مالک ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کل حسین ناموں یا صفات کے لحاظ سے اسم بامستیٰ ہے۔

اسم بے مستیٰ کی انتہائی عبرت انگیز و ایمان سوز مثال حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ کہنا ہے۔ آزری فن تسمیہ بالباطل کے ذریعے لوگوں کو مشرک اور اکابر و اصنام پرست بنانے کی یہ واضح مثال ہے۔

یہ آزر یا مُشْرک و اصنام پرست ہیں جو خیالی یا حقیقی برگزیدہ ہستیوں کو صفاتِ الہیہ کا مالک سمجھتے ہیں اور ان سے ان کو موصوف یا موسوم کرتے ہیں، مثلاً ان کو داتا، کارساز، مُشکل کشا، سمیع و بصیر، مددگار، حاضر و ناظر، حاجت روا و مُستجیب الدعوات وغیرہ وغیرہ ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی بشر یا کوئی اور غیر اللہ نہ صرف ان صفات کا مالک نہیں ہے، بلکہ مالک ہونا ان کے مقدور ہی میں نہیں ہے، لہذا جس ہستی کو بھی ان ناموں میں سے کسی ایک نام سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ اسم بے مُستی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

★ **إِن هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (النجم ۵۳: ۲۳):**

یہ تو صرف نام ہی نام ہیں، یعنی اسمائے بے مُستی ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے (تسمیہ بالباطل کے ذریعے) رکھ لیے ہیں، اللہ نے تو ان کے لیے کوئی دلیل یا سند نہیں اتاری۔



## اُسُوۃُ حَسَنَہ

اس کا مطلب ہے : حسین و کامل نمونہ ؛ انگریزی میں اسے  
Excellent Model کہہ سکتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳: ۲۱):

یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسول (آخر کی سیرتِ طیبہ میں) تمہارے

لیے (زندگی کرنے کا) احسن و اکمل نمونہ ہے۔

۲۳ برس قرآنِ حکیم نازل ہوتا رہا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اپنے تلامذہ و رفقاء کو اس پر عمل کر کے دکھاتے رہے، جسے ہم سائنس

کی اصطلاح میں (Demonstration) کہہ سکتے ہیں۔ اس عمل سے

نبی اکرم کی زندگی قرآنِ حکیم کا عملی نمونہ بن گئی، جسے قرآن نے اُسُوۃُ حَسَنَہ

یا احسن و اکمل نمونے سے تعبیر کیا ہے۔



## إِصْلَاحٌ

الصَّلَاحُ کے معنی ہیں : درست، منظم، منضبط یا متوازن۔  
قرآن حکیم نے ”صلاح“ کو کبھی ”فساد“ کے نقیض کے طور پر استعمال کیا ہے  
اور کبھی سبب کے۔

(ا) فساد کے نقیض کے طور پر :

★ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (الاعراف: ۵۶):  
دیکھو! دنیا میں یا ملک میں ہم آہنگی و توازن اور امن و  
سلامتی کی حالت پیدا ہو جائے تو اس میں نا آہنگی و عدم توازن  
اور برہمی و خرابی پیدا نہ کرو۔

(ب) سبب کے مقابلے میں :

★ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا (التوبة: ۹: ۱۰):  
انہوں نے اعمالِ صالحہ کے ساتھ اعمالِ سوء کو خلط ملط کر دیا۔  
إِصْلَاحٌ میں تزکیہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے جیسے

★ وَأَصْلَحَ بِاللَّهِ (محمد: ۲: ۲):

اور اُس (اللہ) نے ان کی اخلاقی حالت کی تہذیب و تحسین کر دی،  
یعنی اُن کا تزکیہ کر دیا۔

## إِعْتِصَامٌ بِاللَّهِ

یہ اصطلاح دُو معنی ہے۔ اس کا ایک معنی اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ مضبوطی سے جوڑ لینا ہے، یعنی اللہ سے شدید ترین محبت کرنا اور صرف اُسے ہی اپنا الہ و رب بنانا اور پھر اس پر ثابت قدم رہنا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن مجید کا مستقل و مُخلص تلمیذ اور پکا پیروکار بن جانا؛ نیز اُسے ہی اپنا ہادی و مُرشد، مُربی و حُکم اور فُرقان سمجھنا اور بنانا؛ نیز اُس کے ہر قول کو قولِ فیصل اور حرفِ آخر سمجھنا۔ علاوہ بریں، اس کے کُل قوانین و احکام اور تعلیمات پر عمل کرنا اور اُن کے مطابق زندگی کرنا۔

إِعْتِصَامٌ بِاللَّهِ كِي غَيْرِ مَعْمُولِي اِهْتِمَاتِ كَاتِرِ جَمَانِ اللّٰهُ تَعَالٰى كَا يَه  
إِرْشَادِ هِي :

★ وَمَنْ يَّعْتَصِمِ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

(آلِ عَمْرَانَ ۳ : ۱۰۱) :

اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ مضبوطی سے اُستوار کر لیتا ہے، اس کی حسین و فطری اور پائدار راہِ راست کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔

بالفاظِ دیگر، جو اہل آرزو قرآنِ حکیم کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے وہ صراطِ مستقیم کو پالیتا ہے جو اُسے اُس کے الہ و رب کی جائے لقاء۔ جنت میں پہنچا دیتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ قَامَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ  
فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمًا  
(النساء ۴ : ۱۷۵) :

جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے اور اس سے مضبوطی سے رشتہ جوڑتے ہیں یا قرآنِ حکیم کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں، اس کے نتیجے میں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت و فضل (کی جنت) میں داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف آنے کی حسین و فطری اور پائدار راہِ راست پر چلائے گا۔



## اَكِنَّةٌ (حجاب)

کیمرے کے عدسے (Lens) پر ڈھکنا رکھ دیا جائے تو وہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قلب کے عدسے پر شرک و کفر، نفاق اور تکذیبِ کلامِ الہی کے سبب ظلمتوں کی تہیں جم جائیں تو قلب اپنے فطری نور سے محروم ہو جاتا ہے، اس کے نتیجے میں وہ اپنی منزل مقصود دیکھ سکتا ہے نہ اس کی حسین و فطری راہِ راست۔ اس طرح وہ ہدایت سے محروم رہ جاتا ہے۔ یہ ایک قلبی بیماری ہے، جسے قرآن حکیم نے قلب پر پردہ پڑ جانے کی حالت سے تعبیر کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ اِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْا اِذَا اَبَدًا ۝ (الکہف ۱۸: ۵۷):

ہم نے بلاشبہ (اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق) ان کے دل و دماغ پر پردے ڈال دیے ہیں جو انہیں (قرآن حکیم کی) بات سمجھنے نہیں دیتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (لہذا وہ قرآن کی بات سن اور سمجھ نہیں

سکتے) بائٹم انہیں کتنا ہی ہدایت کی طرف بلاؤ وہ کبھی ہدایت نہیں پائیں گے۔

اس کا مطلب ہے کہ قلب اندھا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ قیامت کے روز آنکھوں کے اندھے اٹھائے جائیں گے۔ اس بیماری کی ایک بنیادی وجہ کلامِ الہی سے دوری و مبجوری ہے (ظہ ۲۰: ۱۲۵ بعد)۔





# إِلَه

قرآن حکیم نے اپنی اس بنیادی اصطلاح کی تشریح اپنے اعجازِ بلاغت سے اس طرح کی ہے کہ اس کی معنویت جامع طور پر آشکارا ہو گئی ہے:

★ اَرءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوِيَهُ ۗ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ

وَكَيْلًا ۝ (الفرقان ۲۵: ۲۳):

کیا آپ نے اُس شخص کے (نفسیاتی احوال و ظروف) میں غور

کیا ہے، جس نے اپنی تمنا، خواہش اور جذبے (Lust,

Passion, Desire) کو اپنا الہ یعنی معروضِ آرزو (Object of

desire) بنا لیا ہے؟ کیا آپ اس کے بنگران ہو سکتے ہیں؟

(یعنی نہیں ہو سکتے)۔

★ اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوِيَهُ ۗ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَ

خَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ ۖ وَقَلْبِهِ ۖ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً ۖ

فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ (الجماعہ

۲۵: ۲۳): کیا آپ نے اس شخص (کے نفسیاتی احوال و

ظروف) میں غور کیا ہے، جس نے اپنے جذبہ و عصبیت

اور تمنا و خواہش کو اپنا الہ بنا لیا ہے اور اللہ نے (اپنے

قانونِ احترامِ آرزو اور قانونِ مجازات کی رُو سے، اس کے علم کے باوصف اس پر راہِ مُستقیم گم کر دی اور اس کے سامعہ اور قلب (= دل و دماغ) پر مہر لگا دی اور اس کی باصرہ پر پردہ ڈال دیا۔ اب اللہ کے سوا کون ہے جو اس کو راہِ مُستقیم دکھا سکتا ہے؟ کیا تم لوگ (ان عبرت انگیز اور سچی مثالوں سے) نصیحت و موعظت حاصل نہیں کرتے؟

ان آیاتِ قرآنی میں اللہ کے معنیِ اعجازی انداز میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ بحیثیتِ بشر یہ ہمارا ذاتی تجربہ بھی ہے اور مُشاہدہ بھی کہ جب ہم میں سے کسی شخص کو اپنی (معروض) خواہش و تمنا سے شدید ترین محبت یا عشق ہو جاتا ہے تو وہ اس کی معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور حاکم و مُطاع بن جاتی ہے اور وہ شخص عاشق و غلام کی طرح بغیر سوچے سمجھے، نتانج کی پروا کیے بغیر، بلا چوں و چرا، انتہائی ذوق و شوق سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا اور اس میں اپنی غایتِ زندگی کو مُضمحل سمجھتا ہے، اسے قرآنِ حکیم اپنی خواہش کو اپنا اللہ بنانا کہتا ہے۔

ان تشریحات کی بناء پر اللہ کے معنی ہوئے: معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور حاکم و مُطاع۔

اللہ صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے (البقرة ۲: ۱۶۳)۔

# امراضِ قلب

قلب، انسان کے سینے میں ایک لطیفہٴ غیبی ہے۔ یہ آزاد، خود کار و خود مختار ایک نامیاتی کل (Organic Whole) ہے، جو فطری طور پر حسین ہے۔ جب انسان کے فکر و عمل میں اعتدال و توازن نہیں رہتا تو وہ اپنے حسنِ ربا اعمالِ سوء کے سبب طرح طرح کی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان نفسیاتی بیماریوں کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں امراضِ قلوب سے تعبیر کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ **فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ** ○ (البقرة ۲: ۱۰) و ہواضع کثیرہ :

ان کے قلوب (= دل و دماغ) میں بیماری ہے۔ اللہ اپنے قانونِ احترامِ آرزو اور قانونِ مجازات کے مطابق ان کی یہ بیماری (منافقت) اور زیادہ کرتا جاتا ہے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ حقیقت و واقعیت کا انکار کرنے یا ان کی تردید کرنے کو "کذب" کہتے ہیں۔ کذب ایک ایسی بیماری ہے جس میں مبتلا

ہو کر انسان کو صلاح و فساد میں امتیاز کرنے کا شعور نہیں رہتا، جس کا فطری انجام گمراہی و بربادی ہے۔

قرآنِ عظیم نے جن امراضِ قلب کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اہم ترین کی نشاندہی کر دی جاتی ہے :

### (۱) قساوتِ قلب یا سنگدلی

اس سے قلب مُردہ ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان کے باطنی نظام میں جمود و تعطل پیدا ہو جاتا ہے، نتیجتاً، وہ اپنا وظیفہ سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتا (دیکھیے البقرة ۲: ۷۴، الحديد ۱۶: ۵۷ و بمواضع کثیرہ)۔

### (۲) قلب کا ٹیڑھا ہو جانا

قلب ٹیڑھا ہو جائے تو انسان کی عقل و فکر کی جہت بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور قبلہ بھی۔ اس کے نتیجے میں، انسان فوز و فلاح کی راہِ راست کو چھوڑ کر ہلاکت و بربادی کی ٹیڑھی تڑپھی راہوں پر سفرِ زندگی کرنے لگتا ہے (الصفا ۵: ۶۱؛ آل عمران ۳: ۷۷)۔

### (۳) زنگ آلودگی

اس خطرناک بیماری سے قلب اپنے فطری حُسن و نور سے

محروم ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں، حق و باطل، حسن و قبح، ہدایت و ضلالت، توحید و شرک، حلال و حرام وغیرہ وغیرہ میں امتیاز کرنے کے قابل نہیں رہتا (دیکھیے المطففین ۸۳: ۱۰-۱۲)۔

### (۴) قلب پر پردہ پڑنا

اس بیماری کا مطلب ہے: قلبِ انسانی کا شرک و ظلم، عصبیت و فرقہ پرستی، کفر و تکذیب وغیرہ وغیرہ کے اندھیروں میں کھو جانا۔ اس کے نتیجے میں، انسان راہِ راست کو دیکھ نہیں سکتا اور بھٹکتا رہتا ہے۔ ایسے ہی لوگ قرآنِ حکیم کے قوانین و احکام اور تعلیمات سے نا آشنا رہتے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک نفسیاتی بیماری ہے (الکہف ۱۸: ۵۶ بعد، الإسراء ۱۷: ۲۵ بعد)۔

### (۵) بیماری تغافلِ جاہلانہ

اس بیماری کی وجہ سے انسان کلامِ الہی سے غفلت و جہالت میں رہتا ہے۔ اس طرح اس کلامِ منیر کی روشنی سے اس کا قلب محروم رہتا ہے، جسے قرآنِ حکیم کے اصطلاحی مفہوم میں ”اندھا قلب“ کہتے ہیں۔ ایسے لوگ قیامت کے روز اندھے اٹھیں گے (ظہر

۲۰: ۱۲۲ بعد)۔

مُحْوَلَةٌ بِالْآيَاتِ سے مُسْتَنْبِط ہوتا ہے کہ تغافل و جہل لازم ملزوم ہیں، نیز جو شخص تغافل جاہلانہ میں مبتلا ہوتا ہے، وہ قرآن مجید کے نورِ علم سے محروم ہوتا ہے، اس لیے اس کا نظریہ، قول وغیرہ وغیرہ ناقابلِ اعتبار ہوگا (دیکھیے المؤمنون ۲۳: ۶۲ بعد؛ الذریت ۵۱: ۱۰ بعد و بمواضع کثیرہ)۔

### (۶) قلب کا اندھا ہو جانا

اس نفسیاتی بیماری سے عقل اندھی ہو جاتی ہے اور انسان حُسن کور، حق کور اور کور ذوق ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو قرآن حکیم چوپالیوں سے بدتر اور ان سے زیادہ گمراہ قرار دیتا ہے (الحج ۲۲: ۴۶؛ الاعراف ۱۷۹)۔

### (۷) قلب پرتالے پڑنا

اس کا مطلب ہے باطنی یا قلبی نظام کا مُعْطَل ہو جانا۔ اس کے نتیجے میں، انسان کی عقل و فکر ماری جاتی ہے اور اس کے دل میں حق قبول کرنے کی استعداد مُردہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ چوپالیوں کی طرح حق کور و حُسن کور بن جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو قرآن حکیم نے بہرے اور گونگے کہا ہے (محمد ۲۲: ۲۵)۔

## (۸) قلب پر چھاپ لگنا

کُفر و شرک، فساد و عُدوان، ظلم و کذب ایسے اعمالِ سُوء کا ارتکاب کرنا، آدمی کا شعاع، نیز یہ بیماری اس کی شخصیت کی نشانی بن جائے تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ اُس پر چھاپ لگ گئی ہے۔ طبع کے لیے دیکھیے الاعراف، :۱۰۰ بعد و بمواضع کثیرہ -

## (۹) قلب پر مہر لگنا

اس بیماری کا مطلب ہے: سیئات کے اندھیروں کا انسان کے باطنی نظام کا اس طرح احاطہ کر لینا کہ آفتابِ حق کی کوئی کرن اس کے اندر نہ جاسکے، حُسن و صداقت کی کوئی بات اس کے دل میں اُتر نہ سکے، آدمی سچ سُن سکے نہ عبرت حاصل ہی کر سکے، نیز اس کے کان سچی باتیں سُن نہ سکیں۔ الغرض، وہ اسفل السافلین ہو جائے۔ علاوہ بریں اس کے دل میں نفسیاتی۔ جمالیاتی لمحہ (Psycho-Aesthetic Moment) کی وقوع پذیری کا امکان ختم ہو جائے (البقرہ ۲: ۶؛ الانعام ۶: ۴۶؛ الجاثیہ ۲۵: ۲۳ بعد)۔



# انسان

انسان کو عربی میں انس کہتے ہیں۔ یہ جن کی ضد ہے۔ اس کے مادے میں انس کا مفہوم پایا جاتا ہے، یعنی بل جل کر رہنے کی فطری خواہش و رغبت۔ اس کا موازنہ ”حشی“ سے کیا جاتا ہے۔ اپنی اس سرشتِ انسیبت کی وجہ سے انسان مُتَعَدِّن زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ انگریزی میں انسان کو (Social Animal) یعنی عمرانی حیوان کہا جاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ **وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (الشوریٰ ۴۲: ۳۸) :

اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

انسانیّت کا خاصہ و تقاضا اپنے ہم نفسوں سے محبت کرنا اور کرانا ہے۔ انسان کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ اسم جنس کے طور پر اس سے مراد کل بنی نوع انسان (Mankind) ہوتے ہیں۔





# انفاق

”انفاق“ کے لغوی معانی ہیں خرچ کرنا، لیکن اصطلاحِ قرآنی میں اس کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، یعنی ربِّ العالمین کے نام پر اس کی مخلوقات خصوصاً بنی نوعِ انسان کی کفالت، فلاح و بہبود، مادی و معنوی ترقی، نیز ان کی احتیاجات کو پورا کرنے، ان کے جان و مال کے تحفظ اور ملک کے دفاع کے لیے مال و دولت خرچ کرنا (البقرہ ۲: ۲۶۲، ۲۱۹) و بموضع کثیرہ)۔

انفاق کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس آیت بصیرت افروز سے لگایا جاسکتا ہے :

★ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (آل عمران ۳: ۹۲):

(اے افرادِ نسلِ انسانی!) تم احسان و حسنہ اور نیکی و کسادگی کے نزدیک بھی نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو، جو تم عزیز رکھتے ہو، یعنی مال و دولت وغیرہ وغیرہ۔

جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو اہل ایمان نے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم سے انفاقِ بالمال کی مقدار سے متعلق دریافت کیا تو

آپ پر یہ وحی نازل ہوئی :

★ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرة ۲: ۲۱۹):

اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں  
کتنا مال و دولت خرچ کریں تو اعلان کر دیجیے کہ جو مال و  
دولت جائز ضروریات سے زیادہ ہو۔ انگریزی میں

- Surplus, Shy, Idle, Barren



## أُولُو الْأَلْبَابِ

اس کا مطلب ہے وہ لوگ جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں، اور عقلِ سلیم سے مراد صحتِ مند و حسین اور فعال عقل جو اپنی اصلی فطری حالت میں ہو۔

یہ اہل عقلِ سلیم ہیں، جو اپنے نفس اور کائنات میں بامقصد غور و فکر کرتے ہیں۔

★ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (البقرة ۲: ۲۶۹):  
یہ صرف اہل عقلِ سلیم ہیں جو (اپنے نفسوں اور آفاق میں) بامقصد غور و فکر کرتے ہیں۔

اور

★ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ أَوَلَمْ نَسْخُورْ فِي الْعِلْمِ وَقَدْ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ لَكُلِّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (آل عمران ۳: ۷): حالانکہ ان کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے اور وہ (جانتے ہیں) جو علم میں پختہ ہوتے ہیں، ان کا قول ہے کہ ہمارا ان پر ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ منشا بہات کو) وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اہل عقلِ سلیم ہیں۔

# اولیاء

اولیاء جمع ہے ولی کی، جس کا مطلب ہے : دوست، کارساز، سرپرست، یار و مددگار۔ قرآن حکیم کی رو سے اولیاء کے رنگ و روپ درج ذیل ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ کی دوستی بندے کے ساتھ :

ارشاد ہوتا ہے :

★ نَحْنُ أَوْلِيَائُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ

(حکم السجدة ۴۱: ۳۱):

دُنیا اور آخرت دونوں میں فقط ہم ہی تمہارے دوست و سرپرست ہیں۔

۲۔ بندے کی دوستی اللہ تعالیٰ کے ساتھ :

★ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزَنُونَ ﴿۱۰﴾ (يونس: ۶۲):

گوشِ ہوش سے سُنو! اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے دلوں پر  
خوف مُسلط ہوتا ہے نہ وہ رہیں غم و ملال ہی ہونے  
ہیں، یعنی وہ نفوسِ مُطمئنہ اور وارثِ جنت ہوں گے۔

۳۔ ایمان والوں کی دوستی صرف مؤمنین کیساتھ:

★ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط (النساء ۴: ۱۴۴) :

اے لوگو جو ایمان لائے ہو مسؤمنوں کے بجائے کافروں

کو اپنا دوست نہ بناؤ

(کافروں کے علاوہ یہود و نصاریٰ کی دوستی سے بھی منع

کیا گیا ہے، المائدہ ۵: ۵۱)۔

اولیاء اللہ صرف وہ اہل ایمان ہوتے ہیں جو متقی

یعنی اہل آرزو و خشیت ہوں، عدل و احسان کے کام کرنے

والے ہوں، معاشرے کے فعال لوگ ہوں، اللہ تعالیٰ کی راہ

میں جہاد کرنے والے ہوں۔

بخلاف اس کے، وہ لوگ جو فقر و درویشی یا پیری کا

بخزقہ سالوس پہن کر دوسروں کی کمائی پر زندگی کرتے ہیں، اولیاء اللہ

نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہی ہیں۔

# ایمان

اس کے معنی خوف کے زائل ہونے اور نفس کے مُطمئن ہونے کے ہیں؛ نیز تصدیق کے ساتھ حق کی تسلیم و اطاعت ہے۔  
اصطلاح قرآنی میں ایمان کا مطلب ہے: اسلام کے درج ذیل پانچ ارکان کو تسلیم بالیقین کرنا:

(۱) اللہ تعالیٰ (۲) یومِ آخر (۳) ملائکہ یا فرشتے (۴) سماوی کتابیں اور  
(۵) انبیاء علیہم السلام۔  
ارشاد ہوتا ہے:

★ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ  
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ (البقرة ۲: ۱۷۷):

اور حسنہ کی راہ ان کی ہے جو اللہ پر، یومِ آخرت پر، ملائکہ پر،  
کتاب پر اور انبیاء پر ایمان لاتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ایمان و عمل لازم ملزوم ہیں، لہذا ایمان کے  
بغیر عمل اور عمل کے بغیر ایمان غیر معتبر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ  
ہے کہ قرآن مجید ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ذکر ایک ساتھ اور  
لازم ملزوم کی طرح کرتا ہے، اور ان دونوں کو اسلامی زندگی کی

بنیادیں قرار دیتا ہے (المائدہ ۵: ۶۹، الکہف ۱۸: ۸۸، الفرقان

۲۵: ۴۰) و بمواضع کثیرہ۔

مذکورہ بالا ایمانِ خمسہ سے کسی ایک کا انکار بھی کُفر ہے

(النساء ۴: ۱۳۶)۔



# باطل

باطل اور حق ضدین ہیں، اور باطل کے معنی ہیں: کذب، دروغ، جھوٹ یا کھوٹ، جھوٹی، بے کار و بے مقصد اور فنا ہونے والی چیز یا بات۔ انہیں معانی میں قرآن مجید نے شرک کو باطل کہا ہے (الحج ۲۲: ۶۲)۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۸۱):

بے شک باطل نابود ہونے والا ہے۔

★ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ

هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝ (الحج ۲۲: ۶۲):

یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے (یعنی قائم و دائم رہنے والا

سچ ہے) اور جس چیز اور ہستی کو وہ (مشرک) اللہ کے سوا پکارتے

ہیں وہ باطل ہے (یعنی فنا ہو جانے والا جھوٹ ہے)۔

دیکھو! اصل میں اللہ ہی رفیعُ الشان۔ عالی و جلیل ہے۔

شرک کو قرآن حکیم نے نہ صرف باطل بلکہ ظلمِ عظیم بھی قرار

دیا ہے (نعمان ۳۱: ۱۳)۔



بشرک اور اس کی جملہ اقسام کو زبان و عمل سے ماننے کو قرآن حکیم نے ایمانِ باطل کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ

هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۵۲﴾ (العنکبوت ۲۹: ۵۲):

جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کا انکار کیا، وہی حسات کا نقصان اٹھانے والے ہیں۔



# بصارت و بصیرت

ظاہری آنکھ کے دیکھنے کی قوت کو بصارت کہتے ہیں، جبکہ قلب کی آنکھ کے نورِ بینش کو بصیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان قوتِ بصیرت کی بدولت وقت کے تیور پہچانتا اور تاریخی عمل، عصری تقاضوں اور طبعی و مابعد الطبعی قوانین کا شعور رکھتا ہے؛ نیز حق و باطل، حُسن و قبح، خیر و شر اور ہدایت و گمراہی میں امتیاز کر سکتا ہے۔

إرشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي

فِي الصُّدُورِ ۝ (الحج ۲۲: ۴۶) :

اصل یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ قلوب جو

سینوں میں ہیں (دو) اندھے ہو جاتے ہیں۔

اس إرشادِ الہی کا مطلب ہے کہ انسان کا قلبی نظام اپنے

نور سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی بصیرت و

عقل ماری جاتی ہے۔



## تزکیہ

اپنے جستی۔ قلبی۔ نفسی نظام کی تطہیر، تحسین اور نشوونما کرنے کو تزکیہء نفس کہتے ہیں۔

قرآن حکیم کی رو سے تزکیہ کا مطلب ہے: نفس کو شرک و بت پرستی (مثلاً اکابر پرستی، روضہ و مقابر پرستی، آستانہ پرستی، شبیہ پرستی، اصنام پرستی وغیرہ وغیرہ) کے منفی اثرات یا سیئات سے پاک و صاف کرنا تاکہ جستی۔ قلبی۔ نفسی نظام زندہ و فعال اور حسین و منور ہو جائے؛ نیز اپنی فطری استعدادوں (Potentialities) کو قوت سے فعل میں لانا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

★ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝ (الشمس ۹۱: ۹-۱۰) :

وہ بامراد و کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا (یعنی اُسے کفر و شرک، جرم و ظلم، وغیرہ وغیرہ کے منفی اثرات و سیئات سے پاک و منترہ کر کے نشوونما پانے کے قابل بنا دیا)، لیکن وہ برباد ہو گیا جس نے اسے (اپنی نفسانی خواہشات اور سیئات کے بارگراں تلے) دفن کر دیا (یعنی جو اپنی استعدادوں کو قوت سے فعل میں نہ لایا، وہ بے نیل مرام رہا)۔

# مَقْضُ

یہ ایک قلبی (نفسیاتی) بیماری ہے جسے قرآن حکیم نے قلب پر تالے پڑ جانے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بیماری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان قرآن حکیم پر غور و فکر کر کے علم و حکمت اور نور و ہدایت حاصل کرنے کے بجائے اس پر اپنے دل و دماغ کے دروازے مضبوطی سے بند کر دیتا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝

(محمد ۷۷: ۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دل و دماغ پر تالے پڑے ہوئے ہیں ؟

یہ جملہ استفہامِ اقراریہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا قلبی نظام معطل ہو چکا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں غور و فکر کرنے کا ان کو دماغ ہے نہ یارا۔

حُسن سے محروم قلب کی قساوت و شقاوت اور ظلمت و جہالت جب اس کی فعلی اور انفعالی قوتوں کے لیے ناقابلِ عبور

رُکاوٹ بن جائیں اور قلب اپنے فطری وظائف ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو قرآن حکیم کے محاورے میں کہا جائے گا کہ اُس کے قلب پر قُضَل چڑھے ہوئے ہیں یا اُردو محاورے میں ان کی عقل پڑنا لے پڑے ہوئے ہیں (نیز دیکھیے عنوان ”امراضِ قلب“۔)



# تقویٰ

اس اہم اصطلاحِ قرآنی کا مطلب دُہرا ہے :  
 صراطِ مُستقیم یا راہِ راست اور جنتِ قُرَّةُ الْعین کی آرزو و  
 جُستجو اور راہِ راست سے بھٹک کر جہنم میں جانے کا خوف،  
 دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے قُرب و رضوان کی آرزو و جُستجو اور  
 اُن سے محرومی کی خَشیت، نیز اس کے قوانین کا خوف۔  
 قرآنِ حکیم کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو تقویٰ سے  
 مشروط کیا ہے، یعنی قرآنِ مجید سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے  
 مُتقی ہونا لازم ہے :

★ ذَلِك الْكِتَابُ لِارْتَبِ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ○

(البقرة ۲: ۲):

یہ وہ عظیم کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ یا تردید و  
 اضطراب نہیں پایا جاتا کہ یہ مُتقیوں کو ہدایت دیتی ہے، یعنی  
 اہل آرزو و خَشیت کو راہِ راست اور منزلِ مقصود کی طرف  
 راہنمائی کرتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ تقویٰ اور ہدایت کیوں لازم ملزوم ہیں۔

اس کا سیدھا ساادہ جواب یہ ہے کہ ہدایت اُسے ملتی ہے جس کو اس کی طلب و جستجو ہو۔ مثال کے طور پر، جس شخص کو علم کی طلب و جستجو ہوتی ہے وہی علم حاصل کر کے عالم بن سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عبادت کا مقصود حقیقی تقویٰ ہی ہے (دیکھیے البقرة ۲: ۱۸۳، ۶۳، ۲۱ و بمواضع کثیرہ)۔

اس سے استنباط کر سکتے ہیں کہ جس عبادت سے دل میں تقویٰ فعال نہیں ہوتا وہ عبادت بے اثر و لا حاصل ہوتی ہے۔



# تکذیبِ دین

تکذیب کے معنی ہیں: انسان جس بات کا قولاً قائل ہو لیکن اس کا عمل اس بات کی شہادت نہ دے۔ اصطلاحِ قرآنی میں تکذیبِ دین کا مطلب ہے کہ کوئی اہل ایمان ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نظامِ حیاتِ کُلّی (= دین) کو اپنے اعمال یا بے عملی سے جھٹلائے۔

ارشاد ہوتا ہے:

★ اَرَعَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْذِّينِ ۚ فَذَلِكَ الَّذِي يَحْدِثُ  
الْيَتِيمَ ۚ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۚ قَوْلًا  
لِّلْمُصَلِّينَ ۚ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۚ  
الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۚ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۚ

(الماعون ۱۰۷: ۱-۷):

کیا تو نے اس شخص (کے احوال و ظروف) میں غور کیا ہے جو دین یا اسلام کے نظامِ حیاتِ کُلّی کو عملاً ماننے سے انکار کرتا ہے (یعنی تکذیبِ دین کرتا ہے)۔ یہ وہ ہے جو بے یار و مددگار لوگوں کو دھتکاڑتا ہے اور حاجتمندوں



کی کفالت کا بندوبست کرنے کی ترغیب (حکومت اور  
مُعاشرہ کو قلم و زبان کے ذریعے) نہیں دیتا۔ اُن نمازیوں  
کے لیے تباہی ہے جو اپنی صلوٰۃ کی غرض و غایت اور تقاضوں  
کو سمجھنے سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری یا دکھاوا کرتے  
ہیں اور اشیائے ضرورت کو حاجت مندوں تک پہنچنے سے  
روک دیتے ہیں، یعنی نہیں دیتے۔



# تلاوت

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی کتابوں کے اتباع کو تِلَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ اتباع اُن کی قِرَاءَت (پڑھنے) کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی اُن کے اوامر و نواہی (احکام) پر عمل کرنے کی صورت میں۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ **وَ اَنْزَلْنَا مَا اَوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ كِتَابٍ رَبِّكَ ۗ (الکہف ۱۸: ۲۷) :**

اور (اے پیغمبر!) آپ کے رب کی کتاب جو آپ کی طرف

وحی کی گئی ہے اس کا درس دیں (تاکہ لوگ اس کی پیروی کریں)۔

**القِرَاءَات :** قرآن مجید کا پڑھنا۔ تجوید بھی قِرَاءَات میں آتی

ہے۔ قِرَاءَاتُ الْقُرْآن کے معنی ہیں : میں نے قرآن مجید کو اصولِ تجوید

کے مطابق پڑھا (قاموس، تاج العروس)۔ اس کے مقابل میں تلاوت

کے معنی ہیں : قرآن مجید کا درس دینا، تاکہ لوگ اس کی آیات سن کر

اُن پر عمل کریں۔



## توبہ

اس کے معانی ہیں: جرم و گناہ پر نادم و پشیمان ہو کر صدقِ دل کے ساتھ مغفرت کے لیے ربِّ رحیم سے رجوع کرنا اور عہد کرنا کہ وہ پھر اُس جرم و گناہ کا اعادہ نہیں کرے گا۔

یاد رہے کہ توبہ کا اعتبارِ حُسنِ عمل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

★ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ۝

(الفرقان ۲۵: ۷۱):

اور جو توبہ کرتا ہے، یعنی ندامت و پشیمانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا ہے اور پھر عدل و احسان اور اصلاح و فلاح کے کام کرتا ہے، وہی اصل میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنے کا حق ادا کرتا ہے۔

توبہ حُسنِ عمل سے سچی (یعنی توبۃ النُّصوح) بنتی ہے۔ توبہ کرنے سے آدمی کے اعمالِ سُوء کے آتشیں اثرات محو ہو جاتے ہیں، اور حُسنِ عمل کے ثواب سے سیئات بھی حسنات میں بدل جاتی ہیں (الفرقان ۲۵: ۷۰)؛ نیز سچی توبہ کرنے والے جنت میں داخل ہوں گے (مریم ۱۹: ۶۰)۔ یاد رہے کہ اعترافِ گناہ اور اس سے باز رہنے کا مُصمّم ارادہ پیش شرط ہے توبہ اور اس کی قبولیت کی (التَّوْبَةُ ۹: ۱۰۲)۔

# جلال و جمال

یہ ایک ہی حقیقت کے دو مظاہر ہیں، اور وہ حقیقت ”حُسن“ ہے۔ دوسرے لفظوں میں، جلال و جمال، جو زوجین ہیں، حُسن کے اجزائے لاینفک ہیں۔

جلال (Sublimity)، عظمت و کبریائی، سطوت و ہیبت، دبدبہ و جبروت اور عزت و قدرت کا مظہر ہے۔ اس کے برعکس، جمال، محبوبیت و دلربائی اور لطافت و نزاکت سے عبارت ہے۔ اصل میں جلال و جمال ”حُسن“ کے ذاتی و صفاتی عناصر ہیں اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ میں سے ہیں۔

★ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ (الرحمن ۵۵: ۲۷):  
اور تیرے ربِّ جلالت مآب اور مالکِ صفاتِ جمیلہ کی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے :

★ اللَّهُ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ (المشکوٰۃ) :

اللہ تعالیٰ جمیل ہے (اور) جمال سے محبت کرتا ہے۔

# جنت

جنت کے لغوی معنی ہیں: اشجار سے معمور باغ۔

اصطلاحِ قرآنی میں اس سے مراد بہشت ہے۔  
جنت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اُسے کسی مُتَنَفِّس، یعنی  
کسی بشر، جن یا کسی اور ہستی نے نہ دیکھا ہے اور نہ اس کی  
ماہیت کا علم ہی رکھتا ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

★ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً

بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ (السجدة ۳۲: ۱۷):

کوئی مُتَنَفِّس نہیں جانتا کہ کون سی قُرَّةُ الْعَيْنِ (آنکھوں  
کی ٹھنڈک) شے (انتہائی حسین و سُور انگیز یعنی  
جنت) اُن کے لیے چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ یہ اہل جنت کے  
حُسنِ عمل کا صلہ ہے جو وہ (دُنیا میں) کیا کرتے ہیں۔



# جہاد

اصطلاح قرآن میں اس کا مطلب ہے: انسانی حقوق کے تحفظ، دین (یا نظامِ حیاتِ گلی) کی بقا و سلامتی اور ملک کے دفاع کی خاطر زبان و قلم، مال و دولت اور جسم و جان کے ساتھ جدوجہد کرنا یا قتال کرنا اور اس راہِ حق میں جو مشکلات و خطرات پیش آئیں ان کا صبر و استقامت سے مقابلہ کرنا۔ اسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا کہتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

★ اِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

(التوبة ۹: ۴۱):

جہاد کے لیے نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بھاری اور اپنے مال و دولت اور جسم و جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں دشمنانِ حق کے ساتھ جنگ کرو۔ یہ تمہارے لیے احسن و افضل ہے، اگر تم جانو (نیز دیکھیے المائدہ ۵: ۳۵، الحج ۲۲: ۷۸ و بمواضع کثیرہ)۔

یہ بھی یاد رہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، نیند  
تواصی بالحق و تواصی بالصبر اور تبلیغ اسلام بھی جہاد کی قسمیں ہیں  
(آل عمران ۳: ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۱۴، الاعراف ۷: ۱۵۷، الحج ۲۲: ۴۱؛  
العصر ۱۰۳: ۷)۔

جہاد کرنے والے کو ”مُجَاهِد“، جہاد میں کامیابی حاصل کرنے  
والے کو ”غازی“ اور جہاد میں جان دینے والے کو ”شہید“ کہتے ہیں۔  
جہاد مسلم معاشرے کے افراد اور حکومت پر فرض ہے، لہذا  
جہاد (خصوصاً جہاد بالسیف) کے فرمانِ الہی کا انکار کفر ہے۔



## حُبِّ (یا) مَحَبَّت

حسین چیزوں سے محبت کرنا، جمالیاتی حس کا خاصہ ہے، لیکن قرآن حکیم کی رو سے سب حسین اشیاء، چیزوں اور ہستیوں سے زیادہ اور شدید ترین محبت یا عشق اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ الہ حقیقی ہے۔ عشقِ الہی ایمان کا خاصہ اور تقاضا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرة ۲ : ۱۶۵) :

اور جو اہل ایمان ہیں وہ اللہ سے دیگر ہستیوں اور اشیاء کی نسبت شدید ترین محبت (یا عشق) کرتے ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسان جو اللہ تعالیٰ کا تصوّر تک نہیں کر سکتا اُس سے شدید محبت کرے تو کیسے ؟

یہ مسئلہ بھی قرآن حکیم نے حل کر دیا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحِبُّكُمْ اللَّهُ (آل عمران

۳ : ۳۱) : (اے نبی!) لوگوں پر واضح کر دو کہ اگر تم اللہ سے

محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، یعنی میری سنتِ حسنہ پر



عمل اور میرے اُسوۂ حسنہ کے مطابق کُل زندگی کرو، (نتیجہ) اللہ تم سے محبت کرے گا۔

محبت کا سچا اور عالمگیر معیار یہ ہے کہ انسان کو اپنے اللہ سے شدید ترین محبت ہو۔ اللہ سے محبت ہو تو اس کی مخلوقات سے بھی محبت ہوتی ہے، کیونکہ محبوب کی ہر چیز پیاری ہوتی ہے۔ جذبہ محبت جب قوت سے فعل میں آتا ہے تو رحمت کہلاتا ہے۔ ان معنی میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو ”رحمۃ للعالمین“ ایسے بے مثال لقب سے مُلقب کیا ہے۔ یہ اس واقعیت کی سند ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات سے محبت اور احسان کرتے تھے، اور ان کے لیے رحم و کرم کے جذبات رکھتے تھے۔

یہ اصلِ عظیم یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی دوسری ہستی سے، چاہے وہ کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، محبت کرنا، شریک ہے، اور شریک ناقابلِ معافی ظلمِ عظیم ہے۔



## حُدُودُ اللَّهِ

حدّ کا مطلب ہے : وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان  
اڑ یا روک بن جائے۔ حُدُودِ اللَّهِ سے مراد اللہ کی حد بندیاں  
ہیں، جن سے تجاوز کرنا، اس کی نافرمانی اور ظلم ہے۔

ارشادِ باری اللہ تعالیٰ ہے :

★ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُ وَهَآءِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ

فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ (البقرة ۲: ۲۲۹):

یہ اللہ کی مقرر کردہ حد بندیاں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔  
جو اللہ کی حد سے باہر نکلیں تو وہی ظالم ہیں (یعنی اپنے  
آپ پر ظلم کرنے اور حقوقِ انسانی کو غصب و سلب کرنے  
والے ستمگر ہیں)۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ  
حدودِ انسان کی فطرت کے عین مطابق ہیں، جن کو توڑنے سے  
مُعاشرے میں فتنہ و فساد واقع ہوتا ہے، اور خود ایسا کرنے والا  
انسان اپنا دشمن اور نظامِ اسلام کا تخریب کار بن جاتا ہے۔



# حُسن

یہ اصلاً لطافت ہے؛ دوسرے لفظوں میں، حُسن نظر افروزی و سُرور انگیزی کی مُنترہ و نامُصَوِّر شے ہے، جس کو اپنی پیدائی کے لیے کسی ٹھوس چیز یا شکل کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہے لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن رنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

(غالب)

حُسن کی بڑی شیون یہ ہیں: جمال و جلال، رنگ و نور اور حیات و قیومیت، خوشبو اور نظافت و طہارت وغیرہ وغیرہ۔ حُسن، قُرْآنُ الْعِین ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اہل نظر کو اس کے جمالیاتی مشاہدے سے جمالیاتی حظ و سُرور ملتا ہے۔

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسْرُّ النَّظْرَيْنِ (البقرة ۲: ۶۹)

اور اُس کا رنگ دیکھنے والوں (یعنی اہل نظر) کو مسرت بخشتا ہے۔

اور

وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهَا (الاحزاب ۳۳: ۵۲):

اگرچہ اُن (عورتوں) کا حُسن تجھے تعجب خیز خوشی بخشنے۔

اللہ تعالیٰ "الحسن" ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ وَبِاللّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (الاعراف، ۱۸۰) :

تمام حسین اسماء، یعنی صفات اللہ ہی کے لیے ہیں، یعنی وہ

حسین صفات کا مالک بالذات ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ چونکہ اسمِ بامُسمیٰ ہے، لہذا وہ "الحسن" ہے۔

گویا زندگی کی اصل حُسن ہے، اس کا راز حُسن ہے، اس کی

غایت حُسن اور غایت الغایات "الحسن" کا قُرب و رضوان اور

ہم نظری و ہم کلامی ہے۔



# حُسْنُ الْمَأْتَابِ

یہ قرآنِ حکیم کی جمالیاتی اصطلاح ہے۔ اس کے معانی ہیں:  
 لوٹ کر آنے کی جگہ (یا گھر) کا حُسن۔ اس کی ضد شَرُّ الْمَأْتَابِ ہے۔  
 یہ تعبیر قرآن مجید نے جنتِ قُرَّةِ الْعَیْنِ کے لیے اختیار کی ہے  
 جو اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ جنتِ انسان کا حُسن و سُور سے  
 معمور حقیقی گھر ہے۔ یہ اس دُنیا میں دُوسروں سے احسان کے ساتھ  
 پیش آنے والوں، توازن برقرار رکھنے والے کام کرنے والوں، بندگانِ  
 تسلیم و رضا اور اہل آرزو و خشیت کا گھر ہے، جس میں وہ ہمیشہ  
 رہیں گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

★ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَأْتَابٍ ۝ (ص ۳۸: ۴۹):

اور یہ اہل آرزو و خشیت کے لوٹ کر آنے کا حسین و سُور بداماں

گھر ہے۔

حُسْنُ الْمَأْتَابِ اور شَرُّ الْمَأْتَابِ ضِدِّین ہیں اور دونوں دارالآخرت

میں ہوں گے، جسے قرآنِ حکیم نے "الْحَيَوَانُ" سے تعبیر کیا ہے (العنکبوت

۲۹: ۶۲)؛ یعنی وہ موت سے مُنترہ جہان ہے۔

# حق

اس کی ضد ہے باطل۔ اس کے معنی ہیں: حقیقت، واقعیت، صداقت، سچ یا سچا، حقیقی افادیت و مقصدیت، مفید و سچی شے جو قائم و دائم رہنے والی ہو۔ چنانچہ کائنات کی تخلیق بالحق (الانعام ۷: ۷۳) کا مطلب ہے کہ اسے ربِّ کریم نے بنی نوعِ انسان کے لیے مستقل جمالیاتی و مادی افادیت و منفعت کے لیے مرحلہ وار تخلیق کیا ہے، لہذا یہ باطل نہیں (ص ۳۸: ۳۷) بلکہ پائدار اور افادی و جمالیاتی اقدار کی حامل ہے۔ انہیں معانی میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو ”الحق“ کہا ہے (الانعام ۷: ۶۶)۔

چونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ خود ایک قدیم و مستقل حقیقت اور صداقت ہے، اس لیے اس نے اپنے آپ کو بھی ”الحق“ کہا ہے (الانعام ۷: ۶۲)۔

حق کے معنی جائز حصے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم کا واضح ارشاد ہے کہ ربُّ العالمین نے زمین اور اس میں جو نعمتیں ودیعت کی ہیں، ان میں تمام افرادِ نسلِ انسانی کا مساوی یا برابر کا حصہ ہے (حم السجدہ ۴۱: ۹-۱۰)، اس بناء پر ربِّ رزاق نے اس مساوی

حصّے کو حق معلوم کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :  
 ★ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿المعارج ۷۰﴾ :  
 اور جن کے مال و منال میں مساوی حصّہ ہے ان کے لیے جو  
 (اس سے) محروم اور محتاج ہیں۔

اس حق کو "انسانی حق" (Human Right) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس  
 انسانی حق کو مار کر ہی لوگ مال و دولت جمع کر سکتے ہیں، اس لیے  
 قرآن حکیم نے مال و دولت کو جمع کر رکھنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔  
 یاد رہے کہ انسانی حق غضب و سلب کرنا گناہ کبیرہ ہے (البقرة ۲: ۱۸۸)۔



# حقوق العباد

اس سے مراد بنی نوع انسان کے بنیادی یا انسانی حقوق (Fundamental or Human Rights) ہیں۔ قرآن حکیم کی رو سے بڑے بڑے انسانی حقوق یہ ہیں :

۱۔ مساوی پیداواری حق یا حق معلوم : ارشاد ہوتا ہے :

★ وَجَعَلْ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكْ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلنَّاسِ لَيْلِينَ ۝ (حم السجدة ۴۱ : ۱۰) :

اور اُس، یعنی رپّ جمن، نے اس زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں مسلسل نعمتیں پیدا کرنے کی صلاحیت ودیعت کر دی اور (مخلوقات خصوصاً بنی نوع انسان کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی خاطر اس میں ہر قسم کی غذائی پیداوار یا روزی کا سامان ذخیرہ کر دیا)۔ یہ سب کچھ چار آیام یعنی ادوار میں ہوا۔ ان نعمتوں اور غذائی پیداوار میں (سب) طلبکاروں کا مساوی حق یا حصہ ہے۔



اس آیت کریمہ کی رو سے رب رحمن نے ارضی پیداوار میں ہر فرد بشر کا مساوی حق یا حصہ مقرر کر دیا ہے اور اسے ”حق معلوم“ سے تعبیر کیا ہے (المعارج ۴۰ : ۲۴)۔

۲۔ تکریم انسانی: یعنی ہر انسان کو واجب التکریم سمجھنا فرض ہے۔

★ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (الاسراء ۷۰ : ۷۰) :  
اور ہم نے بنی آدم کو شرف و تکریم سے نوازا، یعنی اُسے  
مکرم بنایا ہے۔

علاوہ بریں، قرآن حکیم کی رو سے دیگر انسانی حقوق یہ ہیں :  
۳۔ آزادی اکتساب: یعنی روزی کمانے کی آزادی (الجاثیہ  
۲۵ : ۲۲، و بمواضع کثیرہ)۔

۴۔ آزادی فکر و عمل : (الاحزاب ۳۳ : ۷۲)۔

۵۔ دین یا نظام زندگی کے انتخاب (Choice) کی آزادی :  
البقرة ۲ : ۲۵۶)۔

۶۔ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا حق : (البقرة ۲ : ۱۲۹، ۱۵۱؛  
آل عمران ۳ : ۱۶۴)۔

۷۔ کفالت کُلّی کا حق : یعنی روٹی، پانی، لباس، مکان، تعلیم و  
تربیت، علاج مُعالجہ، عزّت و آبرو اور جان و مال کے

تَخْفِظُ كَا حَقٍّ : (الْحَجُّ ۲۲ : ۴۱ ، الْمَعَارِجُ ۳۶ : ۲۴ ، حُمَّ السَّجْدِ

۴۱ : ۹ ، ۱۰ ، الْمَاعُونُ ۱۰۷ : ۱۰۷) -

۸- سِيرُ وِصْيَا حَتَّ كَا حَقٍّ : (الْعَنْكَبُوتُ ۲۹ : ۲۰) -

قوم کے ہر فرد کی ان تمام بنیادی یا انسانی حقوق تک رسائی کا  
احسن انتظام کرنا اسلامی حکومت اور معاشرے پر فرض ہے۔



# حکمت

راغب اصفہانیؒ کے نزدیک الحکمة کے معنی علم و عقل کے ذریعے حق بات دریافت کر لینے کے ہیں، حکمتِ الہی کا معنی اشیاء کی معرفت اور ان کو احکام کی غرض و غایت کے ساتھ تخلیق کرنا ہے۔ اور انسان کی حکمت موجودات کی معرفت معلوم کرنا اور حسنہ و خیر اور عدل و احسان کے کام کرنا ہے۔ حکمت لقمان کے یہی معنی ہیں (المفردات)۔

۲۔ حکمت کا مطلب ہے: علم اور حُسنِ عمل، یا اس کے معنی ہیں: احسن و اکمل علم کے ذریعے احسن و اکمل اشیاء کی معرفت (تاج)۔

۳۔ جدید عربی میں، حکمت سے فلسفہ اور سائنس مراد لیے جاتے ہیں (لین)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

★ **إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةً**؛ بعض اشعار حکمت یاد دہانی کے حامل ہوتے ہیں (المفردات)۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے:

★ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا

أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (البقرة ۲: ۲۶۸-۲۶۹):

اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت و کثادگی۔ علم کئی رکھنے والا ہے؛

(اپنے علم سے اپنے قوانینِ احترامِ آرزو و مشیت و حکمت

کے مطابق) جسے چاہتا ہے حکمت (Wisdom) عطا کرتا ہے۔

جسے حکمت عطا ہوئی اسے بلاشبہ خیر کثیر مل گئی یعنی کثرت

سے مادی۔ معنوی فوائد حاصل ہو گئے۔ اس سے صرف

صاحبانِ عقل و دانش ہی سبق حاصل کرتے ہیں۔

اصطلاحِ قرآن میں حکمت کا مطلب نظری و عملی عقلِ سلیم

یا الفاظِ دیگر، کمال و نشمندی اور دانشمندانہ طریقے سے امور

سرا انجام دینے کی صلاحیت ہے۔



# حَمْدٌ

الحمد ایک جامع اصطلاحِ قرآنی ہے۔ اس کے معنی ڈہرے ہیں: (۱) تعریف و ثنا کے جمیل (۲) تشکر و سپاس۔ قرآن مجید موقع و محل کے مطابق اپنی اس اصطلاح کو کبھی تعریف و ثنا، کبھی تشکر و سپاس اور کبھی دونوں معانی میں استعمال کرتا ہے۔

سائش و ثنا کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

★ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ (الانعام ۶: ۱):

تمام تعریف و سائش اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو (ارتقائی انداز میں) تخلیق کیا۔

اور تشکر و سپاس کے لیے:

★ فَفُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ

رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (الانعام ۶: ۴۵):

پھر ظالموں کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا اور تشکر و سپاس ہے اللہ کا (جس نے ظالموں کی بیخ کنی کی) جو تمام اقوامِ عالم کا رب ہے۔

دونوں معنی کے استعمال کے لیے دیکھیے یونس ۱۰: ۱۰ -

حمد فقط اختیاری و ارادی افعال پر کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کا علم حاصل کر کے ان میں غور و فکر کیا جائے تو آدمی منطقی طور پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حمد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جو اللہ کی حمد نہیں کرتے وہ بے علم یعنی جاہل ہوتے ہیں (النحل ۱۶: ۷۵)۔



# حیاتِ طیبہ

اس کے اصطلاحی معنی ہیں: حسین و منور، پاکیزہ و نطیف، مطمئن و خوشحال اور ارتقاء کرنے والی کُل زندگی۔

”کُل زندگی“ کا مطلب ہے: انفرادی - اجتماعی، مادی - معنوی اور دنیوی - اخروی زندگی۔

قرآن حکیم کی رُو سے حیاتِ طیبہ، مؤمن و صالح اور اہل آرزو ہی بسر کر سکتے ہیں۔

★ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوَةً طَيِّبَةً (النحل ۱۶: ۹۷):

جو شخص عدل و احسان اور اصلاح و فلاح کے کام کرے گا،

مرد ہو یا عورت، اور وہ مؤمن بھی ہو تو ہم اس کو دُنیا

میں، حیاتِ طیبہ بسر کرائیں گے۔

حیاتِ طیبہ کی ضد ہے حیاتِ خبیثہ، یعنی ناپاک و غلیظ،

ناکارہ و قبیح زندگی۔



# الْحَيَوَان

اصطلاحِ قرآنی میں اس سے مراد موت سے مُننّزہ جہانِ حیات ہے۔

قرآنِ حکیم نے انہیں معنوں میں دارالآخرت کو الْحَيَوَان کہا ہے:

★ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانِ (العنکبوت ۲۹: ۶۴):

اور آخرت کا گھر یا جہان ایسا جہان ہے جہاں زندگی ہے موت نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ آخرت محض عالمِ حیات ہے، جہاں زندگی ہوگی، موت نہ ہوگی۔

الْحَيَوَان کے دو جہان ہیں: ایک کو جنت اور دوسرے کو جہنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جنتِ قُرْآنِ الْعِینِ میں انسان موت سے مُننّزہ جہانِ حیات جاوے گا، اور جہنم میں وہ موت اور حیات دونوں کی لذت سے محروم ہوگا:

★ ثُمَّ لَا یَمُوتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (الاعلیٰ ۸۷: ۱۳):

پھر وہ وہاں مرے گا نہ زندوں ہی میں ہوگا۔



## ختم

اس کے معانی ہیں: باطنی نظام کا اس طرح مُعطل و مُردہ ہو جانا کہ اس کے اِحیاء کی اُمید نہ رہے۔ یہ ایک قلبی (نفسیاتی) بیماری ہے۔ انسان کی حسین فطرت جب افکارِ باطل اور اعمالِ قبیح کی وجہ سے قطعی طور پر مَسخ ہو جائے اور اس کا قلب کُفر و مَعْصِیَّت کی تاریکیوں میں اس طرح محصور ہو جائے کہ آفتابِ حقیقت کی کوئی کرن بھی اس میں داخل ہونے کی راہ نہ پاسکے تو اس نفسیاتی حالت کو قرآن حکیم کی اصطلاح میں قلب پر ختم یا مُہر لگنا (To seal) کہتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

★ اَفْرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ  
وَوَخَّتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً  
فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○ (الجاثیہ

۲۵: ۲۳):

کیا تو نے اُس شخص (کے نفسیاتی احوال و ظروف اور کردار) میں غور کیا، جس نے اپنی خواہشات (Lusts) کو اپنا اِلٰہ

یعنی معبود و مطاع اور معروضِ خواہش (Object of desire) بنا لیا ہے اور اللہ نے (اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق) اُسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہے، اور اس کے سامعہ اور قلب پر مہر لگا دی ہے (Has been sealed)۔ پس کون ہے جو اللہ کے بعد اس کو ہدایت دے سکے، یعنی راہِ راست دکھا سکے؟ کیا پھر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ انسان کی ہر نفسیاتی بیماری کا علاج ممکن ہے، لیکن جب اس کے دل و دماغ پر مہر لگ جاتی ہے تو یہ مرض لا علاج ہو جاتا ہے اور شفاء کی کوئی اُمید باقی نہیں رہتی۔ ایسے شخص کو حق و صداقت کی دعوت دینا لا حاصل ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ **إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ** ○ **خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ** ○ (البقرة ۲: ۶-۷)

بلاشبہ جن لوگوں نے (حق و صداقت کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا، اُن کے لیے یکساں ہے کہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں۔ اللہ (کے قانون

مکافاتِ عمل نے ان کے دل و دماغ اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور ان کے لیے بھیانک اور شدید ترین عذاب ہے۔  
(نیز دیکھیے عنوان ”امراضِ قلب“۔)



## خُسْر

اس کے بنیادی معنی ہیں : حسنت یا نیکیوں کا خسارہ، زیاں، گھاٹا، نقصان اور کمی۔ یہ قرآن کی فکر انگیز اور جامع اصطلاح ہے جو انسان کی کل زندگی یعنی انفرادی، اجتماعی، مادی، معنوی اور دنیوی۔ آخری زندگی کو محیط ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ○

(الحج ۲۲: ۱۱) : اس نے دنیا میں بھی (بلحاظ حسنت) نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔ یہی تو منہ بولتا گھاٹا ہے۔

زندگی مسلسل گھاٹے میں :

★ وَالْعَصْرِ ○ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَفِي خُسْرٍ ○ (العصر ۱۰۳: ۱-۲) :

تاریخی عمل شاہد ہے کہ انسان (دنیوی اور آخری حسنت کے اعتبار سے) مسلسل گھاٹے میں جا رہا ہے۔

شفاء اور رحمت سے محرومی :

★ وَنُنزِلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ○

وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ○ (الاسراء ۱۷: ۸۲) :

اور ہم قرآن میں سے جو بھی نازل کرتے ہیں اُس میں اُس کے (احکام و تعلیمات کو) تسلیم بالیقین کرنے والوں کے لیے (قلبی و نفسی امراض سے) شفاء اور رحمت ہے، لیکن (ان احکام و تعلیمات کا قولاً یا فعلاً انکار کرنے والے اس سے جتنا زیادہ دُور و مجور ہوتے جاتے ہیں تو وہ) ظالم اُتنا ہی خسارہ پاتے ہیں، یعنی اس کی شفاء و رحمت سے محروم و دُور ہوتے جاتے ہیں۔  
اشیاء میں ملاوٹ یا کم تولنے والے گھٹے میں ہیں :

★ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ○

(الشعراء ۲۶ : ۱۸۱) :

پیمانے پورے بھرا کرو اور اُن (زیاں کار لوگوں) میں سے نہ ہو جانا جو لوگوں کو (وزن اور پیمانے، مقدار، کیفیت یا خالصیت اور قیمت کے لحاظ سے) ان کی چیزیں کم دینے کے عادی ہیں۔



# خلق و امر

مستند قرآن میں خلق کا مستنب ہے: مادی تخلیق

(Material creation) اور امر کا معنی ہے: روحانی ایجاد (Spiritual creation)

اب ان دونوں اصطلاحات کی فرداً فرداً مختصراً

توضیح کی جاتی ہے:

خلق: برپا کرنا، کثرتِ تخلیق یہ ہے کہ وہ جمالیاتی - تزویجی

اور ارتقائی - خایمانی ہے، اور یہ قابلِ تغیر و تبدل ہے۔ چنانچہ

اُس کا ارشاد ہے کہ اُس نے اَلدُّخَانَ، یعنی مختلف قسم کی گیسوں

(Gases) کے ایک عظیم ترین تودے (Mass) سے آسمانوں اور

زمین کو چھپے ادوار (Ages) میں ارتقائی یا تدریجی انداز میں پیدا

کیا (حم السجدة ۴۱: ۹ تا ۱۲)؛ نیز دیکھیے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب

سرگذشتِ فلسفہ، جلد ۱: ص ۳۹۵ بعد)۔

اسی طرح اُس نے جہانِ آب میں ایک نفس یا ایک جراثیم

حیات سے انسان کی چھپے ادوار میں ارتقائی و تزویجی انداز میں تخلیق

کی (الفرقان ۲۵: ۵۴)۔

یہ انسانی جراثیم حیات اللہ کی تخلیقی سنت اور اس کے

قانونِ فلق کے مطابق، شق ہو کر دو حصوں میں منقسم ہو گیا، ان میں سے ایک نر تھا اور دوسرا مادہ، اور یہ عمل مدتوں جاری رہا۔ پھر یہ حیاتیاتی جزوے نشوونما پاتے اور مختلف شکلیں اختیار کرتے، ساحل سے پہلے کھنکھناتی ٹھیکری کی طرح کے علاقے میں جا بسے جسے قرآن حکیم نے صَلَّصَالٍ مِّنْ حَمَآءٍ مَّسْنُونٍ سے تعبیر کیا ہے۔ ہجرت یا سفر کرنا، انسان کا طبعی و معنوی خاصہ ہے۔ چنانچہ وہ یہاں سے ہجرت یا نقل مکانی کر کے بساحل کے متصل خطے میں جا بسے، اس کے لیے قرآن حکیم نے صَلَّصَالٍ كَالْفَخَّارِ کی تعبیر اختیار کی ہے، اس کے معنی ہیں: متعفن کیچڑ ایسی مٹی۔ اللہ جانے کتنی مدتوں کے بعد انسان نے یہاں سے نقل مکانی کی اور ساحل پر اترنا، پہلے وہ طینِ لازب میں، پھر طین اور آخر میں تُرَاب میں جا بسا۔ یہاں آکر اس نے دو قدموں پر چلنا شروع کیا اور راست قامت بن گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رُوح میں سے پھونکا تو اس میں حسی۔ قلبی نظامِ فعال ہو گیا (مفصل بحث کے لیے دیکھیے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر:

سرگزشتِ فلسفہ، حصہ اول، ص ۳۹۸ - ۴۲۳۹ -

سائنس نے بھی قرآن مجید کے اس انکشاف کی تصدیق کر دی ہے، انسان کا بچہ ایک نطفے سے اسی طرح چھے ارتقائی مرحلوں میں پیدا ہوتا ہے (حوالہ مذکورہ)۔

یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔

ان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔



# خليفةُ الارض

اس کا مطلب ہے : زمین یا دنیا میں اللہ کے قوانین کو نافذ اور ان کے مطابق حکومت کرنے والا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً

(البقرة ۲ : ۳۰) :

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین یعنی دنیا میں (انسان کو) خلیفہ یا حکمران مقرر کرنے والا ہوں۔

اور

★ يٰۤاٰدُۤا وَاٰدُۤا اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاٰحْكُمۡ بَيْنَ

النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص ۳۸ : ۲۶) :

اے داؤد! ہم نے تجھے ملک میں خلیفہ یعنی حکمران مقرر کیا ہے، اس لیے تجھ پر لازم ہے کہ تو لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے۔

اصل یہ ہے خلیفہ یا حکمران کا وظیفہ (Function) صرف احکامِ الہیہ کے مطابق حکومت کرنا ہے، جو حکمران ایسا نہیں کرتا وہ

تلمیحِ قرآنی میں فرعون ہے، اُس کے وزراء اور درباری ہامان ہیں اور علماءِ سوء جو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں آزر ہوتے ہیں۔  
 قرآنِ حکیم کی رُو سے خلافت کا حقدار وہ شخص ہوتا ہے جو علم، صحت اور دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے دُوروں پر فوقیت رکھتا ہو (البقرة ۲: ۲۴۷)۔



# خَنَاس

اس کے معنی ہیں : چُپکے سے غلط خیالات پھیلا کر یا وسوسے ڈال کر پیچھے ہٹ جانے یا پوشیدہ ہو جانے والا۔  
خَنَاس کی دو قسمیں ہیں :

ایک ابلیس کی ذُرِّیَّت سے ہے جسے عموماً شیطان کہتے ہیں۔  
نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے کہ ابلیسی شیطان انسان کے خُون میں گردش کرتا رہتا ہے (حدیث نبویؐ در المشکوٰۃ)۔ دوسری قسم ذُرِّیَّتِ اٰدَم سے ہے جسے عام طور سے ”شریر“ کہتے ہیں (الناس

- ۱۱۴ : ۱۴)

دوسری قسم کے شیطانوں کا کام لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنا ہے۔ وسوسہ اندازی کے معنی ہیں : اللہ تعالیٰ کے پُرَّان اور احکام و تعلیمات کے بارے میں انسان میں بدگمانی پیدا کرنا یعنی انسان کو اس کے الہ و رب، قرآن حکیم، حق و صداقت، عدل و احسان، حسنہ و خیر (صراطِ مُسْتَقِیْم) سے دُور کرنے یا رکھنے کی خاطر ورغلانا، اُسے بَشْرک و کُفْر، ظلم و جرم اور عُدْوَان و حُدُوْدِ شِکْنِی پُرکسانا، فواحش و مُنْکَر اور مُخْلِ و جمعِ مال کی ترغیب دینا اور زکوٰۃ و اَلْعَفْوُ

دینے سے باز رکھنے کی کوشش کرنا۔

اسلامی معاشرے میں عائلی زندگی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عائلی زندگی سے خاندان بنتا ہے اور خاندانوں سے قوم یا امت تشکیل پاتی ہے۔ اس اعتبار سے خاندان قوم کی اساس ہوا، جس کے اتصال کے لیے شیطان (ابلیسی ہو یا انسانی) میاں بیوی میں بدگمانی پیدا کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شیطان قرآن حکیم کا دشمن ہے اور مسلمانوں کو اس سے دُور و مہجور رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اس لیے رب رحمن نے ہمیں قرآن حکیم کی تلاوت کرنے سے پہلے تعوذ پڑھنے، یعنی شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی تاکید کی ہے (التخل ۱۶: ۹۸)۔

اس بحث سے اس امر کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں قرآن حکیم نے ہمیں شیطان یا خناس کی وسوسہ اندازی سے رب رحمن کی پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلٰهِ النَّاسِ ۝  
 مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي  
 صُدُورِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

(الناس ۱۱۴: ۶ تا ۷)

کہو! میں بنی نوعِ انسان کے پروردگار و آقا، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور حاکم و مُطاع کی پناہ مانگتا ہوں، یعنی پناہ میں آنے کی استدعا کرتا ہوں، اُس وسوسے ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے قلوب میں (جو سینوں میں ہیں) وسوسے ڈالتا ہے، جنّتوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔



# خوف و حُزن

الخوف کے معنی ہیں : قرائن و شواہد سے کسی آنے والے خطرے کا اندیشہ کرنا۔ خوف کی ضد امن ہے اور یہ امور دنیوی و اُخروی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے (بنی اسرائیل ۱۷: ۵۷)۔  
 الْحُزْنُ وَالْحَزْنُ کے لغوی معنی زمین کی سختی کے ہیں؛ نیز غم کی وجہ سے جو اضطراب و بے قراری طبیعت کے اندر پیدا ہوتی ہے اسے بھی حُزْن یا حُزْن کہا جاتا ہے (التوبة ۹: ۴۰)۔  
 خوف، مستقبل کے اندیشوں پر بولا جاتا ہے، جبکہ حُزْن ماضی کے مصائب و نقصانات اور حادثات سے پیدا ہونے والے اضطراب و بیقراری کی آگ کے کرب و غم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خوف و حُزْن سے قلب میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس بناء پر "عذاب النار" کی اصطلاح قرآنی آتشِ خوف و حُزْن اور آتشِ جہنم دونوں پر حاوی ہے (البقرة ۲: ۲۰۱):

خوف و حُزْن عبارت ہے نفسیاتی امراض سے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں: احساسِ تنہائی، پریشانی، اعصابی دباؤ، کھنچاؤ، انتشارِ ذہنی، فشارِ دم یا بلڈ پریشر، احساسِ محرومی،

خوفِ مرگ و زیاں، کربِ خطر، بے خوابی وغیرہ وغیرہ۔  
یہ اس یقینِ محکم یا ایمان کے فقدان کے سبب لاحق ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے، جو رحمان و رحیم، مولیٰ و نصیر، مستجیب الدعوات اور غفار و تواب ہے، نیز اُس کے سوا کوئی ہستی بھی کسی کو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ  
الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي  
كُنتُمْ تُوعَدُونَ ○ (حُم السَّجْدَةِ ۴۱ : ۳۰) :

جن لوگوں نے کہا : اللہ ہمارا رب (پروردگار) ہے اور پھر اپنے اس قول و قرار پر ثابت قدم رہے، ان پر یقیناً فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں : ہرگز خوف نہ کھاؤ اور نہ غم ہی کرو، بلکہ خوش ہو جاؤ، جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔“

مُحَوَّلَةٌ بِالْآيَةِ قُرْآنِيَّةً فِي مِيقَاتِ غُورِ وَفِكْرِ كَرِيمٍ تَوَاسُّتِجَةً بِرَبِّهَا  
فِطْرِي أَمْرٌ هُوَ أَنَّ خَوْفَ وَحُزْنَ عِلَامَتٌ هِيَ الْإِنْسَانِ كَيْفَ نَاكَا مِذْنَابُ  
أَوْرِدُ زَخْمِي هُوَ كَيْفَ مَوْجِدٍ أَوْرَاهِلِ آرْزُ وَخَشْيَتِ خَوْفَ وَحُزْنَ  
كَكَرْبٍ سَعَى مَحْفُوظٍ وَمُطْمَئِنِّ رَهْنَتِي هِيَ۔

# دَھَر

اللہ تعالیٰ زمان و مکان (Time & Space) کا خالق ہے۔

اس لیے ان سے ماوراء ہے۔ لیکن وہ جس عالم میں رہتا تھا اور رہتا ہے، ظاہر ہے وہ کوئی اور ہی عالم ہوگا، اس لیے وہ عالمِ زمان و مکان نہیں ہو سکتا، لہذا اُسے لا زمان و لا مکان کہتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم نے اس کے لیے ”دَھَر“ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ دَھَر ایک حالِ مُدام و سرمدی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ، جو قدیم و زندہ اور فعال و قیوم ہے ہر آن اپنے جلال و جمال کی شانِ نو بنو دیا ہر لحظہ نئی جمالیاتی۔ تخلیقی فعلیت میں جلوہ افروز رہتا ہے (الرَّحْمٰن

- ۵۵: ۲۹ -

انسان کا جہان عالمِ زمان و مکان ہے اور اللہ تعالیٰ کا جہان دَھَر ہے۔ دَھَر کی ابتداء و انتہا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن زمانے کا ظہور اُس وقت ہوا، جب آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہوئی۔ سلسلہٴ زمان کی کڑیوں کو آن (لحہ یا لحظہ)، روز و شب، ماہ و سال، قرن اور عصر کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے زمان کو



دَہر ہی کے غیر مرئی سلسلے کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ هَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا

مَذْكُورًا ○ (الدَّہر ۶: ۱) :

بے شک دَہر میں انسان (Mankind) پر ایک وقت ایسا بھی  
گُزرا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔



# دین

دین کا اطلاق اپنے وسیع تر مفہوم میں عملی و نظری ”طریق زندگی“ پر ہوتا ہے۔ اس اصطلاح قرآن کا بنیادی مفہوم ہے: انسان کی انفرادی و اجتماعی، مادی و معنوی اور دنیوی و اخروی زندگی کا نظام۔ ارشاد ہوتا ہے:

★ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ

النساء ۴ : ۱۲۵ :

اور اس شخص سے احسن و اکمل اور کس کا دین، یا کُل حیاتِ انسانی کا نظام ہو سکتا ہے، جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہو اور وہ احسان کرنے والا بھی ہو۔

★ اَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْإِيمَانِ ۚ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ  
الْيَتِيمَ ۚ وَلَا يَحِضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۚ

الماعون ۱۰۷ : انعام ۳۱ :

کیا تم نے اس شخص کے احوال و ظروف میں غور کیا ہے جو دینِ اسلام کے نظامِ زندگی کو جھٹلاتا ہے، وہ جو یتیم کو دھنکاڑتا ہے اور (معاشرے اور حکومت کو) ترغیب

نہیں دیتا کہ اہلِ احتیاج کو اس کے مُقرر کردہ حصّے کا رزق  
( = حق معلوم ) اُسے فراہم کرے۔

★ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران ۳: ۱۹):  
دین ( عملی و نظری طریقِ زندگی ) تو اللہ کے نزدیک صرف  
اسلام ہے۔

”دین“ کی اصطلاح کو قرآن حکیم نے بدلہ و مُکافات کے معنی

میں بھی استعمال کیا ہے:

★ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ○ (الفاتحہ ۱: ۴):

جزا و مُکافات کے دن کا (تنہا اور بلا شریکِ غیرے) مالک۔

اور آئین کے معانی میں بھی:

★ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (يوسف ۱۲: ۷۶):

(یوسفؑ کا شہار نہ تھا، کہ وہ اپنے بھائی کو بادشاہ

(مصر) کے شاہی قانون کے مطابق پکڑتا۔

اکثر لوگ ”مذہب“ کو دین کے مترادف کے طور پر استعمال

کر لیتے ہیں جو سراسر غلط ہے، کیونکہ مذہب کا معنی مکتبِ فکر

(School of Thought) ہے۔



## ذکر

”ذکر“ ایک وسیع المعانی اصطلاحِ قرآنی ہے، جسے قرآن حکیم نے ان معانی میں استعمال کیا ہے: قرآن مجید، نصیحت، صلوة، تفکرِ بالحق، یاد کرنا، شرف و عظمت، اسماءِ حسنیٰ کا ورد کرنا وغیرہ وغیرہ۔

## قرآن مجید کے معنی میں:

★ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۱۵۰ (الحجر ۱۵: ۹):  
 بے شک یہ ذکر (قرآن) ہمیں نے (بذریعہ وحی) نازل کیا ہے اور ہمیں اس کے محافظ ہیں، یعنی اس کو لفظی و موضوعی تحریفات سے تحفظ فراہم کرنے والے ہیں۔

## نصیحت:

★ فَذَكِّرْ تَفَاٰنَمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝۸۸ (الجاثیة ۸۸: ۲۱):  
 (اے پیغمبر!) آپ بند و نصیحت کرتے رہیں، یقیناً آپ بند و نصیحت کرنے والے ہیں۔

## صلوٰۃ:

★ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ** (الجمعة ۶۲: ۹):  
 اسے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب جمعہ کے وقت قیامِ  
 صلوٰۃ کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر یعنی قیامِ صلوٰۃ  
 کے لیے جلد (مسجد) جاؤ اور خرید و فروخت ترک کر دو۔

## مُشَاهِدَةٌ وَتَفَكُّرٌ:

★ **وَمَا ذَرَأَاكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ  
 لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ** (النحل ۱۶: ۱۳):  
 اور "اُس" نے زمین میں جو مختلف رنگوں کی چیزیں پیدا  
 کیں، اس میں رہنما نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے مُشاہدہ  
 اور غور و فکر کرنا جن کا معمول ہے۔

## يَادِ يٰ تَذَكَّرُهُ

★ **فَاذْكُرُونِي أَذْكَرُكُمْ** (البقرة ۲: ۱۵۲):  
 سو تم مجھے یاد کرو (یعنی میری صفات اور قوانین و احکام کا  
 تذکرہ یا اظہار و ابلاغ کرو) میں تمہیں یاد کروں گا (یعنی

تمہارا ذکر بلند کروں گا۔

## شرف و عظمت :

★ وَإِنَّكَ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۗ (الزخرف ۲۳: ۲۴) :  
دیکھیے : آپ کی اور آپ کی قوم کی عظمت و رفعت کا راز  
اس میں مُضمَر ہے۔

## اسماءِ حُسنیٰ کا وِرد :

★ وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلاً ۝ (الدھر ۴: ۲۵) :  
اور صُبح و شام اپنے رب کے اسماءِ (حُسنیٰ) کا ورد کرتے رہو۔



# زَنَکُ الْوُدْغِ

قلبِ انسانی کی مثال ایک صاف و شفاف اور لطیف و حسّاس آلے (Instrument) جیسی ہے؛ یہ اگر شرک و جرم اور تکذیب و تکبر ایسے گناہ کے سبب اپنے فطری وظائف ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو اُسے زَنَکُ لُگ جاتا ہے۔ یہ ایک قلبی نفسیاتی بیماری ہے جسے قرآن حکیم نے ”زَنَکُ الْوُدْغِ“ سے تعبیر کیا ہے۔  
 ارشاد ہوتا ہے:

★ کَلَّا بَلْ نَسْتُرَانِ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ المطففين

۸۳: ۱۴: بلکہ ان کی سیاہ کاریوں کے سبب ان کے قلوب کو زنگ لگ چکا ہے۔

انسان جب روزِ حساب و جزا اور جہنم کے عذاب کی تکذیب، حدودِ اللہ سے تجاوز و سرکشی، آیاتِ الہیہ کی تکفیر و تکذیب کرتا ہے تو اس کے قلب کو زنگ لگ جاتا ہے (المطففين ۸۳: ۱۰ تا ۱۶)۔  
 قلب کو زنگ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بیماری کے سبب اس پر حُسن و حق کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔ بالفاظِ دیگر، اس میں اثر پذیری کی استعداد مسلوب ہو جاتی ہے (نیز دیکھیے عنوان ”امراضِ قلب“)

## رَبِّ

امامِ راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں: الرَّبُّ کے معنی کسی چیز کو درجہ بدرجہ نشوونما دے کر حدِ کمال تک پہنچانا (المفردات) یعنی اپنی تخلیقات کی اس محبت و شفقت کے ساتھ پرورش و نگہداشت کرنا جس محبت و شفقت سے ماں اپنی اولاد کی پرورش و نگہداشت کرتی ہے، نیز اس کی استعدادوں (Potentialities) کو اس طرح قوت سے فعل میں لانا کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے۔

قرآن مجید کی اصطلاح میں رب کے معانی کا خلاصہ یہ ہے: اللہ وحدہ لا شریک جو اپنی جملہ مخلوقات، خصوصاً بنی نوع انسان کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر حدِ کمال تک پہنچاتا ہے، اور ان کا مالک و آقا اور ہادی و منعم ہے، نیز ان کا رازق و پروردگار، حاجت روا و مددگار، مولیٰ و کارساز، مشکل کشا و دشگیر ہے اور دعائیں سننے اور قبول کرنے والا ہے، اس لحاظ سے وہ بنی نوع انسان کے لیے کافی ہے۔ لہذا انسانوں کو "اُس" کے سوا اوروں کو ارباب (رب کی جمع) بنانے کی حاجت نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو شرک کرتا ہے، جو ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ اور ظلمِ عظیم



ہے (نقمن ۳۱: ۱۳)۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ  
الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي

كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○ حم السجدة ۴۱ : ۳۰ :

جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے اور وہ اس قول و قرار پر قائم رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو ان سے کہتے ہیں کہ، خوف کھائیں نہ غم ہی کریں بلکہ خوش ہو جائیں اُس جنت میں جانے کے لیے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

اسلام توحید اَوْحِيَّتِ و رُبُوبِيَّتِ کا علمبردار ہے۔ اس کا

مطلب ہے تنہا اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک ماننا اور اپنا رب

سمجھنا اور عملاً دیگر ارباب و الہتہ کی نفی کرنا (الفرقان ۲۵ : ۱-۳)؛

التوبة ۹ : ۳۱ ؛ حم السجدة ۴۱ : ۳۰۔



# رجیم

رجیم کے معنی ہیں کسی پر پتھر پھینکنا، سنگسار کرنا (یس ۳۶) :  
 ۱۸؛ قرآن مجید کی رو سے رجیم کے معنی لعن بھی ہیں اور لعن کے معنی ہیں :  
 ناراضگی کی بناء پر کسی کو اپنے سے دور کر دینا (المفردات، بذیل مادہ ر ج م)۔  
 یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے  
 لعنت کا مطلب انسان یا جن کا قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل  
 کی رو سے اپنے الہ و رب کی رحمت و مغفرت اور قرب و  
 رضوان، نیک و نبوی و اخروی حسنہ اور حیاتِ طیبہ سے دور ہو جانا  
 ہے۔ ایسے ہی شخص کے لیے قرآن مجید نے رجیم یا ملعون کی تعبیر  
 اختیار کی ہے (الاحزاب ۳۳: ۶۱)۔ ارشاد ہوتا ہے :

★ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ

إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ۝ (الحجر ۱۵: ۳۲-۳۵) :

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (اے شیطان!) تو یہاں سے نکل جا،

کیونکہ تو ملعون ہے اور یقیناً یومِ حساب و جزا تک تم پر

لعنت ہے، یعنی تو میری رحمت و مغفرت، قرب و رضوان

اور نبوی و اخروی حسنہ سے محروم و دور رہے گا۔

# الرحمن

یہ ایک ازبس اہم قرآنی اصطلاح ہے، جو فقط اللہ تعالیٰ کی ذات سے خاص ہے۔ قرآن حکیم نے اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور اس کی دو بنیادی صفات (رب اور الہ) کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

قُلْ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمَنَ ۖ (الاسراء: ۱۰۷ : ۱۱۰ :)

کہہ دیجیے! اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو (ایک ہی

بات ہے)۔

★ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ ۗ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

(الرعد: ۱۳ : ۳۰) :

اور یہ رحمن کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے : وہی تو میرا رب ہے، جس کے سوا کوئی الہ یعنی معبود و محبوب اور حاکم و مطاع نہیں

اس سے مستنبت ہوا کہ ”رحمانیت“ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عین

ذات ہے۔ جب احسن الخالقین نے جمالیاتی تخلیقی فعلیت کا

آغاز کیا تو سب سے پہلے اسی صفت کا ظہور ہوا (ظہ: ۲۰ : انعام: ۷۸)۔

یہی وجہ ہے کہ جب قرآن حکیم کا نزول شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے الرحمن کو الرحیم سے پہلے رکھا۔ رحمن کے معانی ہیں: رحمن بالذات، ازل سے اپنی مخلوقات، خصوصاً بنی نوع انسان سے شدید ترین محبت و شفقت کرنے اور ان کو دنیوی و اخروی حسنہ عطا کرنے والا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کو قرآن مجید سکھاتا رہا ہے اور ابد الابد تک سکھاتا رہے گا (الرحمن ۵۵: ۱-۲)۔



# رحمت

یہ قرآن مجید کی کثیر المعانی اصطلاح ہے جو رحمانیت و رحیمیت، دنیوی و اخروی حسنہ، احسان و خیر، شفقت و محبت، ہمدردی و غمگساری، عفو و درگزر، فیاضی و کریمی، لطف و کرم اور ایشار و قربانی کے مفاہیم پر حاوی ہے۔ رب رحمن نے جذبہ رحمت کو انسان میں ودیعت کیا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو

رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ کہا ہے :

★ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ (الانبیاء ۲۱: ۱۰۷):

اور (اے ہمارے پیغمبر!) ہم نے آپ کو تمام اقوام عالم

اور دیگر مخلوقات کے لیے رحمت محض بنا کر بھیجا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی سیرت طیبہ اور سنت حسنہ

کے فیضان سے ہر زمان و مکان کی مخلوقات بہرہ مند ہوتی

رہیں گی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ کا بہیناں لقب خود

رب رحمن نے عطا کیا تھا اور اسے آپ کا طغرائے امتیاز کہیں تو

جسے ہونا ہو گا۔ اس کے ساتھ رحمت کو جس اصل غنیمت سے آگاہ  
 فرماتا ہے غنیمت غنیمت کے نفس و اعلیٰ مقام پر پہنچتے ہیں۔ اس  
 سے ہر شے ہزار گونے ہیں۔ رحمت اللعالمین اور خلق غنیمت  
 اور مغفرت ہیں۔

قرآن مجید کی شہادت و نعمت کے کتب کی رحمت کے  
 معنی ہیں: انبیاء و ائمہ و اولاد و غیرہ سے مراد ہر وہ شے  
 جسے جو آدمی کے لیے باعث مسرت و طمانیت ہو، مثلاً کامیابی،  
 خوشحالی، ترقی، مال و دولت، صحت، آل اولاد و غیرہ وغیرہ،  
 اور خوف و حزن کے کرب سے نجات والے والی ہو۔ آخر وہی  
 حدیث سے مراد مغفرت و بخشش، جنت فرج العین اور اس کی  
 بے قیاس نعمتیں ہیں دو جیسے آل عمران ۳: ۱۰۶، ۱۰۷، الاعراف  
 ۷: ۱۴۹، ۱۵۱، النور ۲۴: ۲۱، ۲۲، القمص ۲۸: ۷۳، المؤمن  
 ۴۰: ۹ و ہواشع کثیرہ۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف، ۱۵۶):

اور میری رحمت تمام اشیاء کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رحمت میں آنے کا مطلب، اللہ کی

پناہ اور نظرِ کرم میں آنا ہے (الاعراف، ۱۵۱)۔

# الرحیم

رحمن اور رحیم میں رحمت کے تمام معانی اور ترحم کی جملہ کیفیات کا اجتماع ہے۔ یہ اسلام کا ایسا بنیادی کلمہ ہے جس سے اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کا تعین ہو جاتا ہے کہ اللہ ہر حال میں رحم کرنے والا یعنی بے انتہا ترس کھانے، درگزر اور دلدار دور کرنے والا اور رحمت سے نوازنے والا ہے۔ اور بندہ ہر صورت میں اُس کی رحمتوں کا محتاج ہے۔

احسن الخالقین نے انسان کو پیدا کیا اور اسے فکر و عمل اور ارادہ و اختیار کی آزادی ودیعت کر کے زمین میں خلیفہ مقرر کر دیا۔ افرادِ نسلِ انسانی سے ارادی یا غیر ارادی طور پر جرم و گناہ سرزد ہوئے تو وہ اُن کے اثرات سے خوف و حزن کی آگ کے عذاب میں مبتلا ہو گئے، اور ان کے دل میں حسرت و ندامت کے جذبات اُمنڈ پڑے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے سرچشمہ رحمانیت سے رحیمیت کا چشمہ پھوٹا جو گلشنِ حیات کے گوشے گوشے کو سیراب کرنے لگا، اور اُس نے توبہ و استغفار کرنے والوں کی آتشِ قلب کو ٹھنڈا کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ

ان صفاتِ رحیمیت کا مالک نہ ہوتا اور انسان کو بخشش و معافی کی امید نہ ہوتی تو ہمارے لیے یہ دنیا حسین ہوتی نہ زندگی۔  
 ربِّ رحیم کی رحمت سب مخلوقات کے لیے ہے، لیکن خاص طور پر ان پر ارزانی ہوتی ہے جو اُس کی آرزو کرتے ہیں۔  
 اپنے اس قانونِ احترامِ آرزو کی بناء پر، جسے سنتِ الہی سے تعبیر کر سکتے ہیں، ربِّ رحمن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردے میں ہر انسان کو یہ دُعا مانگنے کا ارشاد فرمایا ہے:

★ وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّحِمِينَ ○

(المؤمنون ۲۳ : ۱۱۸) :

اور دُعا مانگو: میرے رب! میری سیئات کو محو کر دے اور ان سے میری حفاظت فرما اور مجھے اپنی رحمت سے نواز۔ بیشک تو کل رحم کرنے والوں سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔  
 ★ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ○

(الاعراف ۷ : ۱۵۵) :

(اے رب! تو ہی ہمارا ولی یا دوست و کارساز ہے۔ لہذا سیئات یا گناہوں سے ہماری حفاظت فرما، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو سب سے بڑھ کر بخشنے اور سیئات محو کرنے والا اور ان سے حفاظت کرنے والا ہے۔



# رِضْوَان

اس کا مطلب ہے : اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی جو اُس کے بندوں کے لیے عظیم ترین نعمت ہے۔  
 ارشاد ہوتا ہے :

★ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿التوبة﴾

۹ : ۷۲) : اور اللہ تعالیٰ کی رضا تو سب سے بڑی نعمت

ہے، یہ انسان کی عظیم کامیابی ہے۔

ہر عبادت کا، انفرادی ہو یا اجتماعی، ایک بڑا مقصد

رِضْوَانِ اِلٰہی کا حصول ہے۔ یہ اصل عظیم یاد رکھنے کے قابل

ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا انہیں حاصل ہوتی ہے، جو اُس

کے اہل تسلیم و رضا بندے ہیں اور سب سے زیادہ محبت اُس

سے کرتے ہیں؛ اُس کی نعمتوں پر خوش ہونا اور اُس کا شکر بجالانا،

جن کا شعار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، وہ ہر مسئلے اور ہر معاملہ میں

صرف "اُس" کی طرف (یعنی قرآن کی طرف) رجوع کرتے ہیں۔ ایسے

ہی اہل آرزو و خشیت (مُتَّقِی) اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرتے ہیں

اور جنت میں جاتے ہیں (الفجر ۸۹ : ۲۸ تا ۳۰)۔

# زکوٰۃ

اس از بس اہم اصطلاحِ قرآنی کا مفہوم یہ ہے : ہر صاحبِ نصابِ مسلمان پر قرآن و سنہ کے مطابق اپنے کل مال و منال، قیمتی اٹالوں، منقولہ و غیر منقولہ جائداد، تجارتی اشیاء، صنعتی پیداوار یا مصنوعات، مشینری اور آلات وغیرہ کی مالیت پر ڈھائی فی صد سالانہ کے حساب سے اسلامی / مسلم حکومت کو رقم دینا فرض ہے، اور حکومت کا، اپنے اہلکاروں کے ذریعے، یہ رقم یا زکوٰۃ وصول کرنا اور سرکاری خزانے یا بیت المال میں جمع کرنا، پھر اس سرمائے سے اہل احتیاج کی کفالت کا نظام قائم کرنا، بنیادی فریضہ ہے۔ کفالت کا مطلب ہے: بے کار و ضرورت مند لوگوں کے لیے روزگار کا بندوبست کرنا، نیشنل ان کے لیے رزق، کپڑے، مکان، تعلیم و تربیت اور مفت علاج معالجے کا انتظام کرنا۔ علاوہ ازیں ان کی احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے احسان کاری (یعنی قرضِ حسنہ اور مالی امداد دینے) کا احسن و پائدار نظام قائم کرنا، ایسے زکوٰۃ کا بنیادی معنی اور مقصد ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا  
الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَاللَّهُ  
عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (الحج ۲۲: ۴۱) :

(سچے مسلمانوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ، جو نہی ہم ان کو  
زمین میں اقتدار و حکومت دیتے ہیں تو وہ (رسول اکرم  
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح بلا تاخیر)  
صلوٰۃ، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام  
قائم کرتے ہیں، اور کُل اُمور کے فیصلہ کرنے کا اختیار صرف  
اللہ تعالیٰ کو ہے۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں: تطہیر کرنا، پاک و صاف کرنا، نشوونما  
پانا۔ ان معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ زکوٰۃ دینے سے  
باقی مال پاک ہو جاتا ہے (بخاری)۔



# زیغ قلب

اس کا مطلب ہے کہ کسی نفسیاتی بیماری کی وجہ سے انسان کالج اندیش اور کج رو ہو جانا، جس کے نتیجے میں اُس کے فکر و عمل کی راہ و جہت ٹیڑھی ہو جاتی ہے، اور وہ راہِ راست سے بھٹک کر دوزخ کی ٹیڑھی ترچھی راہوں پر سفرِ زندگی کرنے لگتا ہے۔ اصل میں یہ ایک قلبی بیماری ہے، جسے قرآن حکیم کی اصطلاح میں زیغ قلب سے تعبیر کیا گیا ہے، بالفاظِ دیگر، جو شخص صراطِ مستقیم سے بھٹک کر ٹیڑھی و ترچھی راہوں پر ہولیتا ہے تو اُس کی کج روی سے اس کا نفسیاتی توازن بگڑ جاتا ہے، جسے قرآن حکیم نے زیغ قلب کہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ لِقَوْمٍ لِّمَ تُوذُوْنِیْ وَكَدَّتْکُمْ وَاَنْتُمْ  
اَنْتُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَ اللّٰهُ

لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (الصّف ۶۱ : ۵) :

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا : اے میرے برادرانِ قوم! تم مجھے کیوں ایذا دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں

تمہاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ چنانچہ جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ نے (اپنے قوانین مجازات و احترام آرزو کے مطابق) ان کے دل ٹیڑھے کر دیے اور اللہ (اپنے قانون مکافات عمل کی وجہ سے) حدِ اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

عقلِ سلیم کا خاصہ ہے کہ اُسے ہمیشہ حق و صداقت کی آرزو اور تلاش رہتی ہے، لیکن جب وہ بعض عوامل کی وجہ سے بگڑ جاتی ہے تو اس کی فکر کی چہت ٹیڑھی ہو جاتی ہے، جسے قرآن حکیم نے زریغ قلب یا دل و دماغ کی کجی سے تعبیر کیا ہے (آل عمران ۳: ۷۷)۔



# سادات و اکابر پرستی

یہ شرک ہے جو توحید کی ضد اور ناقابلِ معافی ظلم و گناہِ عظیم ہے؛ نیز اس سے انسان جنت کو جانے والی راہِ راست سے بھٹک کر دوزخ کے راستوں پر سفرِ زندگی کرنے لگتا ہے۔ یہ اصلِ عظیمِ مشرکوں پر روزِ قیامت آشکارا ہوگی اور وہ اس طرح اس کا اعتراف کریں گے:

★ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلًا ○

(الاحزاب ۳۳: ۶۷):

(مُشْرِك جب اُلے مُنہ جہنم کو دھکیلے جائیں گے تو) وہ اس واقعیت کا اقرار کریں گے کہ ہم اپنے سادات اور اکابر کا کہا مانا کرتے تھے، نتیجتاً، انہوں نے ہم پر صراطِ مستقیم یعنی جنت کو جانے والی راہِ راست گم کر دی (اور ہم جہنم کے راستے پر چل پڑے)۔

اس واقعیت کو قرآنِ حکیم نے اس طرح بھی بیان کیا ہے:

★ اِتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

إِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبة ۹: ۳۱) :

انہوں (یعنی اہل کتاب) نے اپنے علماء اور راہبوں،  
 درویشوں اور مشائخ، کو اللہ کے سوا اپنے رب، یعنی  
 رازق، اُن داتا اور کارساز بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح  
 ابن مریمؑ کو بھی، حالانکہ ان کو ایک الہ، یعنی معبود و محبوب،  
 مطلوب و مقصود اور حاکم و مطاع کے سوا کسی اور کی  
 طاعت اور فرمانبرداری کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔  
 حقیقت یہ ہے کہ ”اُس“ کے سوا کوئی الہ نہیں اور وہ  
 منزه و پاک ہے اُن کے مشرکانہ عقائد و رسوم سے  
 اور اُن سے جن کو وہ اللہ کا شریک ٹھیراتے ہیں۔  
 اپنے علماء و مشائخ، پیروں اور فقیروں کی باتوں اور  
 احکام کو اس طرح قولاً اور فعلاً تسلیم کرنا، جس طرح اللہ تعالیٰ کی  
 باتوں اور احکام کو تسلیم کرنا چاہیے، سادات و اکابر پرستی ہے۔  
 اس پر درج ذیل حدیث طیبہ سے استشہاد کیا جاتا ہے :  
 حضرت عدی بن حاتمؓ جو پہلے عیسائی تھے، رسول اکرم  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام  
 ہوئے تو انہوں نے آپ سے عرض کیا : مذکورہ بالا آیت  
 میں ہم پر اپنے علماء اور درویشوں کو اپنا رب بنا لینے کا

جو لازم ثابت کیا گیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ ہم  
 اُن کی عبادت تو نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا: ”کیا ایسا  
 نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہرا دیتے ہیں، تم حرام  
 سمجھ لیتے ہو، جس بات کو حلال کر دیتے ہیں، حلال مان  
 لیتے ہو؟“ عرض کیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: ”یہی تو اُن  
 کی عبادت کرنا ہے“ (ترمذی۔ البیہقی، رقی سنن)۔





# سُبْحَانَ

یہ لفظ اسمائے حسنیٰ سے ہے۔

سُبْحَانَ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی اہم ترین اصطلاحات میں سے ہے۔ اس کا مطلب دُہرا ہے : ایک یہ کہ وہ اپنی ذات میں بے نیاز و بے احتیاج ہے ، دوسرے وہ ہر قسم کے عیب، نقص اور شرکت و معاونت سے نیز ابنیت، تثلیث، اوتاریت ایسے تمام مشرکانہ عقائد سے پاک و منزہ ہے۔ اس آیت بصیرت افروز کا یہی مطلب ہے :

★ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ ○ (الصُّفُت ۳۷ : ۱۵۹) :

اللہ تعالیٰ ہر قسم کے باطل و مشرکانہ عقائد سے جو اس کی ذات و صفات سے منسوب کیے جاتے ہیں ، پاک و منزہ ہے۔



# سجدة

یہ قرآن حکیم کی وسیع المعانی اصطلاح ہے : مثال کے طور پر، سر تسلیم خم کرنا، سرنگوں ہو جانا، اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بن جانا، اپنی خواہشات و تمنیات کو بھلا کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے (Surrender) کر دینا، نیز عبادت یا پرستش و بندگی کرنا۔ قرآن حکیم نے اس اصطلاح کو موقع و محل کی مناسبت سے ان تمام معانی میں استعمال کیا ہے، جن کی علیحدہ علیحدہ صراحت کی جاتی ہے :

۱۔ تعظیم و فرمانبرداری کے معانی میں :

★ فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتَ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُودًا

سَجِدِينَ ۝ (الحجر ۱۵: ۲۹) :

جب اُسے (یعنی بشر کو) راست قامت بنا دوں اور اس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دوں تو اس کے سامنے سرنگوں ہو جانا، یعنی اس کے مطیع و فرمانبردار بن جانا۔

اور

★ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۝ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكْذِبُونَ ۝ (الانشقاق ۸۴: ۲۱-۲۲) :

اور جب ان کو قرآن سنایا جاتا ہے تو مان کر سر تسلیم خم نہیں کرتے، بلکہ منکرانِ حق اُسے جھٹلاتے ہیں۔  
نکاتہ: کڈبوں نے یسجدوں کی تفسیر کر دی ہے۔  
تکذیب کی ضد تصدیق ہے، اس سے مستنبط ہوا کہ یسجدوں کا مطلب تصدیق و تسلیم کرنا ہے۔

ب۔ صلوٰۃ میں سجدہ بھی قیام و رکوع کی طرح ایک اہم رکن ہے :

★ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (الحج ۲۲: ۷۷) :

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع و سجدہ کرتے اور اپنے رب کی اطاعت و بندگی کرتے رہو اور لوگوں کو دنیوی و اخروی حسنہ پہنچانے کے کام کرتے رہو تاکہ تم مادی و معنوی نشوونما اور کامیابی پاؤ۔

اور

★ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ (الدھر ۷۶: ۲۶) :

اور رات کے ایک حصے میں اُس (اللہ) کے حضور سر بسجود ہو جایا کرو اور گئی رات تک اس کی تقدیس و تہذیب کرتے رہو۔

ج۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینے کے معافی میں :

★ **وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ** <sup>السجدة</sup> (العلق ۹۶: ۱۹) :

اپنے رب کا بندہ تسلیم و رضا بن کر اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دو اور اس کا تقرب حاصل کرو۔

یہ ایک بجدہ جسے نوگراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(علامہ اقبالؒ)



## سِحْر

قرآن حکیم نے سحر کو شعبدہ گری یا شعبدہ بازی، فریب اور نظر بندی وغیرہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ سحر چونکہ ہر صورت میں باطل ہے، اس لیے اسے باطل یا جھوٹ کے معانی میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے :

★ قَالَ بَلِّ الْقَوْمَ فَإِذَا جَبَّالُهُمْ وَعِصْبُهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ

سِحْرِهِمْ أَنَّهُمْ تَسْعَى ○ (طہ ۲۰: ۶۶) :

(موسیٰ نے) کہا ابلکہ پہلے تم (جو تمہیں ڈالنا ہے) ڈالو، جب انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو دفعتاً نظر بندی کی وجہ سے موسیٰ نے گمان کیا جیسے وہ ادھر ادھر تیز تیز رہیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ رسیوں اور لاٹھیوں نے تیز تیز رنگنا شروع نہیں کر دیا تھا، بلکہ شعبدہ گروں کی نظر بندی کے باعث حضرت موسیٰ کو ایسا دکھائی دیا۔

★ وَالْقِيَمَافِي يَمِينِكَ تَلَقَّفْ مَا صَنَعُوا إِنَّمَا صَنَعُوا

كَيْدُ سِحْرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّحْرُ حَيْثُ أَتَى ○ (طہ ۲۰: ۶۹) :

اور (اے موسیٰ!) جو چیز (یعنی عصا) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے اُسے پھینکو (یعنی زمین پر ڈال دو)، جو کچھ شعبدہ گروں نے بنایا ہے اُسے وہ نِگَل جائے گا، جو کچھ انہوں نے بنا کر دکھایا ہے وہ شعبدہ گروں کے ہتھکنڈے ہیں، اور شعبدہ باز جس عالم میں بھی ہوں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

گویا رسیاں اور لاطھیاں جو شعبدہ بازوں نے پھینکی تھیں وہ جوں کی توں زمین پر پڑی تھیں۔ لیکن (نظر بندی کی وجہ سے) لوگوں کو اور حضرت موسیٰؑ کو تیز تیز رنگتیں نظر آ رہی تھیں حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا عصا زمین پر پھینکا تو وہ سب سے بڑا اژدہا بن گیا اور رسیوں اور لاطھیوں کو نِگَل گیا۔ فرعون کے شعبدہ باز جو اپنی شعبدہ گری یا نظر بندی سے کما حقہ آگاہ تھے، فوراً تارکے کہ ہمارا سحر جھوٹا اور یہ تو سچ ہے اور معجزہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ کی عطا کے بغیر کوئی شخص دکھا نہیں سکتا۔ لہذا سجدے میں گر کر پکار اُٹھے کہ ہم رب ہارونؑ و موسیٰؑ پر ایمان لائے (طہ ۲۰ : ۷۰)۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر تخلیق کی قدر (Value) مقرر کی ہوئی ہے (الفرقان ۲۵ : ۲)، جس کو تبدیل کرنے کی طاقت دُنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایسا صرف

اللہ ہی کے حکم سے ممکن ہے، اور اسے مُعجزہ کہتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض پیغمبروں کو عطا فرمایا تھا کہ وہ کافروں پر اِتمامِ حُجَّت کر سکیں۔ ارشاد ہوتا ہے :

★ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَى ○  
(طہ: ۲۰: ۲۱): اللہ تعالیٰ نے فرمایا! اسے پکڑ لو اور ڈرو

مت، ہم اسے ابھی پہلی سرشت پر لوٹا دیں گے۔

اس آیہ بصیرت افروز سے یہ اصلِ عظیم معلوم ہوئی کہ سحر

کی وجہ سے اشیاء کی سیرت یا فطرت نہیں بدلتی، بلکہ بدلی ہوئی

دکھائی دیتی ہے، جبکہ مُعجزے سے سیرتِ اشیاء تبدیل ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے ”سحر“ کو جھوٹ اور فریب کے معنی میں بھی

استعمال کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَلَئِنْ قُلْتُمْ إِنَّكُمْ مَرْسُوعُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ

كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ○ (صودا: ۱۱: ۱۲):

اگر آپ ان سے کہیں کہ تم موت کے بعد (دوبارہ) زندہ اٹھائے جاؤ گے تو جو نہیں مانتے وہ کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلا جھوٹ

یا جادو ہے (یا فریب دینے والی بات ہے)۔

یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا جھوٹا بھی ہے کہ ”جادو برحق

ہے، لیکن کرنے والا کافر ہے“۔ وجہ یہ ہے کہ جادو برحق نہیں بلکہ باطل ہے۔

# سَمِعُ الْحِسَابِ

اس کا مطلب ہے : اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال کا، خواہ صالحہ ہوں یا سوء، فی الفور یا ساتھ ساتھ حساب چکانے والا ہے۔ امتحانِ گاہِ دنیا میں انسان رہیں مُکافاتِ عمل ہے۔ ہر اچھے یا بُرے عمل کے اثرات فی الفور اُس کے قلب پر مُرتب ہوتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ کے اثرات طمانیت خیر و مسرت آفریں، اور اعمالِ سوء کے اثرات غم انگیز و خوف آفرین ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے لیے دنیا میں ہر آن، آن حساب و جزا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ وَاللَّهُ سَمِعُ الْحِسَابِ (البقرة ۲: ۲۰۲) :

بے شک اللہ فی الفور حساب چکاتا ہے۔

یاد رہے کہ انسان کے عمر بھر کے اعمال کا مُکمل حساب قیامت کو ہوگا اور ساتھ ہی اُس کے جنت یا دوزخ میں جانے کا حکم سنایا جائے گا۔ اس لیے وہ جزا کا دن (یوم الدین) ہوگا۔

★



## سلیم

السَّلَامُ وَالسَّلَامَةُ کے معنی ہیں : ظاہری و باطنی آفات و امراض سے پاک اور محفوظ و مصئون ہونا (المفردات)۔ احسن الخالقین نے اپنی ہر تخلیق صوری و معنوی طور پر حسین بنائی ہے (السجدة ۳۲: ۴۰، المؤمن ۲۰: ۶۴)۔ اگر وہ چیز اپنی حسین و فطری حالت میں ہو تو اُسے ”سلیم“ کہتے ہیں، مثلاً قلبِ سلیم اور عقلِ سلیم وغیرہ وغیرہ۔

انسان کے اپنے عمل یا اعمالِ سوء کی بناء پر اگر قلب مختلف اخلاقی و نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے تو وہ سلیم نہیں رہتا۔ قرآنِ حمید کی رو سے قلب کی بیماریاں مندرجہ ذیل ہیں :

- ۱۔ وہ کج یا ٹیڑھا ہو جاتا ہے (الصّف ۶۱: ۵)۔
- ۲۔ زنگ آلود ہو جاتا ہے (المطفّفين ۸۳: ۱۰ تا ۱۴)۔
- ۳۔ اس پر طبع لگ جاتی ہے (مُحَمَّد ۲۷: ۱۶)۔
- ۴۔ وہ مہر بند ہو جاتا ہے (الجاثیہ ۲۵: ۲۳)۔
- ۵۔ اس پر فضل لگ جاتا ہے (مُحَمَّد ۲۷: ۲۳ تا ۲۵)۔
- ۶۔ وہ اندھا ہو جاتا ہے (الحجّ ۲۲: ۴۶)۔

نیز دیکھیے عنوان "امراضِ قلب"۔ (مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو،  
ڈاکٹر نصیر احمد ناصر: جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں، فیروز سنز  
لمیٹڈ، لاہور، کراچی)۔

یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ حاملِ قلبِ سلیم ہی  
وارثِ جنت ہے :

★ یَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۚ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝

(الشعراء ۲۶ : ۸۸-۸۹) :

بروزِ قیامت مال و دولت اور بیٹے کسی کام نہیں آئیں گے،  
مگر جو شخص قلبِ سلیم (یعنی فعال و حرکی اور حسین و متور باطنی  
نظام کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کے حضور آئے گا (وہی جنت  
میں جائے گا)۔

قرآن حکیم کی اصطلاحات (صاحبِ قلبِ سلیم اور "نفسِ مطمئنہ"  
ہم معنی مترادفات ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ جس طرح صاحبِ قلبِ سلیم  
جنت میں جائے گا، اسی طرح مطمئن نفس بھی جنت میں جائے  
گا (الفجر ۸۹ : ۲۷-۳۰)۔



## سَيِّئَةٌ

[ہر شے جو انسان کو غم میں مبتلا کر دے اُسے سُوء کہا جاتا ہے، خواہ وہ اُمورِ دنیا سے تعلق رکھتی ہو یا آخرت سے (المفردات)]۔  
یہ حسنة کی ضد ہے۔ اصطلاحِ قرآن میں حسنة کے معنی ہیں :  
ہر وہ شے جو طمانینت و مسرت دے اور قلب کو باغ باغ کر دے؛ اور اُخروی حسنة سے مُراد اُن دیکھی جنتِ قُرَّة العین ہے (البقرة ۲: ۲۰۱)۔ بخلاف اس کے، سَيِّئَةٌ سے مُراد ہر وہ شے ہے جو خوف و حُزن پیدا کرے اور دل میں آگ لگا دے۔

بنی نوعِ انسان میں وہ لوگ جو اعمالِ سُوء، یعنی کُفر و شرک، ظلم و استحصالِ حقوقِ انسانی غصب و سلب کرتے، فواحش و مُنکر اور فتنہ و فساد پھیلاتے، جرم و تخریب کاری کرتے اور معاشرتی زندگی کا توازن بگاڑتے ہیں، تو اُن کے اعمال کے اثرات، یعنی خوف و حُزن کی آگ، پلاتا خیر اُن کے قلوب کو مُجیٹ ہو جاتی ہے؛ نتیجتاً، وہ دُنیا میں اہلِ نار بن جاتے ہیں۔  
ایسے لوگ آخرت میں ہمیشہ کے لیے آتشِ دوزخ میں جلتے

رہیں گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ  
فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

(البقرة: ۲: ۷۸):

اصل یہ ہے کہ جو کوئی اعمالِ سوء کرے گا تو اس کے  
اعمال کے فطری اثرات (اس کے قلب کو) گھیر لیں گے۔  
ایسے لوگ اہلِ نار ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں  
گے۔



# شَرٌّ

شَرٌّ ضد ہے خیر کی۔ قرآن حکیم اس کو عموماً سیئہ کے معانی میں استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ہر شے جو کل زندگی (انفسِ آدمی و اجتماعی، مادی و معنوی یا دنیوی و اخروی) کے لحاظ سے نقصان دہ، ضرر رساں، موجب تنزیل و انحطاط اور غم انگیز و خوف آفریں ہو، شَرٌّ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ (المعارج ۴۰ : ۲۰) :

(انسان اتنا کم حوصلہ ہے کہ) جب اُسے شَرٌّ پہنچتا ہے، یعنی اُسے نقصانِ جان و مال ہوتا ہے تو گھبرا اٹھتا ہے۔

چنانچہ سورہٴ فلق میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر قسم کے شَرٌّ سے اس کی پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے (الفلق ۱۱۳ : ۵۵)۔



# شُرک

الشَّرِكَةُ وَالْمُشَارَكَةُ کے معنی ہیں : دو ملکیتوں کو باہم ملا دینا۔  
 بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں : ایک چیز میں دو یا  
 دو سے زیادہ آدمیوں کا شریک ہونا (المفردات) E  
 شُرک از بس اہم اصطلاحِ قرآن ہے۔ شُرک کی ضد توحید  
 ہے۔ قرآن حکیم کی رُو سے اللہ وحدہ لا شریک ہے اور کوئی شے  
 اس کے مثل نہیں (الشوریٰ ۲۲: ۱۱)، چنانچہ کسی ہستی کو اس کی  
 ذات، صفات، تدبیرِ امور یا امورِ خدائی میں شریک ماننا  
 شُرک ہے۔

إرشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ  
 وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمْرُوْا۟ اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ وَاَحَدًا  
 لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبة ۹: ۳۱):  
 انہوں (یعنی اہل کتاب) نے اپنے عالموں، مشائخ،  
 درویشوں اور صوفیوں کو اپنے ارباب (رب کی جمع)، یعنی رازق  
 پالنہار، ان داتا، مشکل کشا، حاجت روا وغیرہ وغیرہ

بنایا ہے اور مریمؑ کے بیٹے مسیحؑ کو بھی، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ فقط اللہ واحد کی عبادت کریں، اُس کے سوا کوئی معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور حاکم و آقا نہیں۔ وہ بے نیاز و بے احتیاج ہے، نیز اس بات سے مُنترہ و ماوراء ہے کہ اُمورِ خدائی میں اُس کا کوئی شریک ہو۔

شُرک کی متعدد اقسام ہیں، مثلاً ابنیت و تثلیث اور اوتاریت کے عقائد، نیز ساداتِ پرستی و اکابرِ پرستی (یعنی اپنے بزرگوں، مشائخ و علماء اور صوفیہ، شہداء، ائمہ، وغیرہ وغیرہ) کو اپنے ربِّ سمجھنا اور بنانا اور اُن کی باتوں اور حکموں کو اس طرح ماننا جس طرح ربُّ العالمین کے حکموں کو ماننا چاہیے، علاوہ ازیں، اصنامِ پرستی (یعنی قبر، روضہ، مجسمہ اور شبیہ و نجومِ پرستی، فرقہ پرستی وغیرہ وغیرہ)؛ غیر اللہ کو مدد یا حاجت روائی یا مُشکل کشائی و کار سازی کے لیے پکارنا۔

قرآن مجید کی رو سے شُرک ظلمِ عظیم ہے (تعمان ۳۱: ۱۳)۔

اور

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شُرک کرتا ہے، یعنی اُس کی ذات و اُمورِ فرماں روائی میں کسی کو شریک اور اُس کا معاون قرار دیتا ہے، اُس پر جنت حرام کر دی گئی ہے (المائدہ ۵: ۷۲)۔

## شہید جمع شہداء

شہادت کے معنی ہیں : طلب و جستجوئے حق، صداقت کا حق اِبتقین، حق کی گواہی دینا، حق کی تصدیق و تائید کرنا اور حق کی خاطر جان تک قربان کر دینا۔ علاوہ بریں، اس میں مُشاہدہٴ جمال و جلالِ دوست کا مفہوم بھی مُضمّن ہے۔ اس اعتبار سے شہید طالب و شاہدِ حق ہوتا ہے اور قتیلِ حق بھی، یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ آدمی صاحبِ عقلِ سلیم اور اہلِ آرزو و خشیت ہو، اور غور کے کانوں سے سُننا اور ویدہٴ عبرت نگاہ سے تفکرِ بالحق کرنا، اُس کا شعار ہو۔

إرشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ

وَهُوَ شَهِيدٌ (ق ۵۰ : ۳۷) :

(ان واقعات و حقائق میں) اس شخص کے لیے عبرت و

تنبیہ ہے جو قلبِ سلیم و حاضر رکھتا اور غور کے کانوں سے

سُننا ہے (یعنی ایسا کرنا اس کا شعار ہے)۔

شہداء، اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندے اور اہلِ جنت



ہوتے ہیں، جن کی رفاقت کی قرآن حکیم نے تعریف کی ہے  
(النساء ۴: ۶۹)۔

شہید دراصل اُس راسخُ العلم مردِ حق کو کہتے ہیں جو جان پر  
کھیل کر بھی حق کی شہادت دے۔

شہید، علم حاصل کر کے دُوسروں کو سکھانے یا پہنچانے کو بھی  
کہتے ہیں (الحج ۲۲: ۷۸)؛ دیکھیے لسان العرب، تاج العروس،  
المحکم۔



# شیطان

یہ اپنی خلقت کے اعتبار سے ”ناری“ اور جنوں میں سے ہے (الکہف ۱۸: ۵۰) اس لیے غیر مرئی ہے۔ یہ ابلیس اور اُس کی ذریت میں سے ہے، اور انسان کی فطرتِ علم اور خلافتِ ارضی سے حسد کی وجہ سے اُس کا کھلا دشمن ہے۔

انسان فطرۃً حُسن پسند ہے، اور شیطان اُس کی اس جمالیاتی کمزوری سے واقف ہے، لہذا وہ انسان کی قبیح خواہشات کو اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے خوبصورت و دلکش بنا کر دکھاتا ہے تاکہ وہ اُن پر عمل کرے۔ اس طرح اُسے مُشْرک و کافر اور مُجْرِم و غاصبِ حقوقِ انسانی بناتا اور اُسے انسانیت کے ارفع و اعلیٰ مقام سے دھکیل کر بہیمیت کے تحت الشّامی میں گرا دیتا ہے۔

★ وَلَٰكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الانعام ۶: ۴۳) :

بلکہ ان کے دل اور سخت ہو گئے اور شیطان ان کے اعمال انہیں خوشنما و دلکش بنا کر دکھاتا رہا۔

قرآن مجید نے مُفسِد و شریر اور ظالم و فتنہ پرداز انسانوں کے لیے بھی شیاطین کی تعبیر اختیار کی ہے، جن کے چار بڑے گروہ یہ ہیں: ہر زمانے کے فرعون، ہامان، قارون اور آزر (المجادلہ

۵۸: ۱۹ بعد)۔

ہر انسان کا شیطان ہوتا ہے جو اس کا رفیق یا ساتھی ہوتا ہے، جسے قرآن حکیم "قرین" کہتا ہے (ق ۵۰: ۲۷)۔ ایک روایت کی رو سے یہ خون کی طرح جسم میں گردش کرتا رہتا ہے۔ نفس گشتی سے شیطان مرتا نہیں، البتہ انسان اپنے تقویٰ کے بل پر اس شیطان کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا سکتا ہے (حدیث نبوی)۔



# صالح

یہ ایک جامع قرآنی اصطلاح ہے۔ اس کے بنیادی معانی ہیں : عدل و احسان ، اصلاح اور فلاح و بہبود کے کام کرنے والا ، نیز فتنہ و فساد ، ظلم و ستم اور مشرکانہ عقائد و رسوم اور مخاصمت و تعصبات کو دور کرنا ، لوگوں میں صلح و صفائی کرانا اور حیاتِ اجتماعیہ میں امن و سلامتی اور توازن و ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرنا اس کا شعار ہو۔ قرآنِ مجید نے اسے فساد، جبر اور سپیٹہ کی ضد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (البقرة ۲: ۱۱) :

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین (یعنی دنیا یا ملک) میں فساد نہ کرو، یعنی خرابی یا بد نظمی پیدا نہ کرو، تو کہتے ہیں کہ ہم تو احوال و ظروف کی اصلاح کرنے یا ہیئتِ اجتماعیہ میں توازن پیدا کرنے والے ہیں۔

★ إِنْ تُرِيدُوا إِلَّا أَنْ تَكُونُوا جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا شَرِيدٌ أَنْ

تَكُونَنَّ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ○ (القصص ۲۸: ۱۹) :  
 انہوں نے کہا: (اے موسیٰ!) تم تو یہی چاہتے ہو کہ مُلک  
 میں سرکشی اور ظلم و ستم کرتے پھر و اور یہ نہیں چاہتے کہ  
 امن و سلامتی اور توازن و ہم آہنگی کے کام کرنے والوں  
 میں شامل ہو۔

★ مَن عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ  
 بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ○ (حم السجدة ۴۱: ۴۶) :

جو شخص اعمالِ صالحہ کرتا ہے، یعنی عدل و احسانِ فلاح و  
 بہبود اور اصلاح کے کام کرتا ہے تو وہ اپنے لیے ہی کرتا  
 ہے، یعنی اُن کا اجرِ حسنہ (یا حسینِ صلہ) اسے ملے گا۔  
 بخلاف اس کے، جو شخص اعمالِ سوء کرتا ہے، یعنی کُفرو  
 شرک، تکذیبِ حق، غضب و سلبِ حقوقِ انسانی اور  
 جور و ستم کرتا ہے، اُس کا وبال اسی پر ہوگا۔ یاد رکھو کہ تمہارا  
 پروردگار اپنے بندوں کے ساتھ ہرگز نا انصافی نہیں کرتا۔

صالح شخص اللہ تعالیٰ کا دوست ہوتا ہے (الاعراف، ۱۹۶)۔

صالح لوگوں کا شمار اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں میں  
 ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی رفاقت کو حسین رفاقت سے تعبیر کیا ہے۔  
 (النساء ۴: ۶۹)۔

# صبر

صبر کے معنی ہیں : مشکلات و خطرات کے سامنے ثابت قدم و سیدھے سپر رہنا، مصائب و شدائد کو عزم و ہمت اور حوصلے سے برداشت کرنا، مسائل حل کرنے کے لیے مسلسل سعی و جہد کرتے رہنا۔ قرآن حکیم کی رو سے، یہ خسارے سے محفوظ رہنے کی پیش شرط ہے (العصر ۱۰۳: ۱-۳)۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِرُوا وَرَابِطُوا وَالْقَوْلُ لِلَّهِ  
لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ○ (آل عمران ۳ : ۲۰۰) :

اے ایمان والو! صبر یعنی مشکلات و خطرات میں استقامت و ثابت قدمی اور حوصلہ مندی و پامردی کے ساتھ دشمنوں کے سامنے سیدھے سپر رہنے کو اپنا شعار بناؤ اور صبر میں مددِ مقابل حریفوں سے سبقت لے جاؤ، اور آپس میں رابطہ استوار رکھو، نیز اللہ کی طلب و آرزو کرتے رہو، اور اس کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ڈرتے رہو تاکہ تم دنیوی و اخروی حسنہ پاؤ۔

راہِ راست پر استقامت و استقلال سے گامزن رہنا اور راستے کی مشکلات کا ثابت قدمی و بہمت سے مقابلہ کرنا، اس طرح کہ پائے استقامت کو لغزش نہ آئے، عبارت ہے ”صبر“ سے، اور اس کی باہم تلقین و تاکید کرتے رہنا انسان کو حنات کے خسارے سے محفوظ رکھتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ صبر کا حکم دیتا ہے (العصر ۱۰۳ : ۱-۳)۔



## صِبْغَةُ اللَّهِ

اس کے لفظی معانی ہیں : اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگے جانا، لیکن اصطلاح میں اس کا مطلب ہے : اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کو اپنے اندر اپنے ظرف کے مطابق جذب کرنا اور لوگوں سے معاملہ کرتے وقت ان کا اظہار کرنا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً زَوْجِنُ لَهُ

عَبْدُونَ ○ (البقرة ۲ : ۱۳۸) :

ہم اللہ کی صفات سے اپنے خلق کو مزین کرتے ہیں، اور صفاتِ حسنہ کے لحاظ سے اللہ سے حسین تر اور کون ہو سکتا ہے ؟ اور ہم تو فقط اسی کی طاعت و بندگی کرنے والے ہیں۔

صِبْغَةُ اللَّهِ کی احسن و اکمل مثال نبی اکرم صَلَّی اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی سیرتِ طیبہ ہے ؛ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اُسے اُسوۂ حسنہ سے تعبیر کیا ہے (الاحزاب ۲۱ : ۲۱)۔





## صدر

یہ اصطلاحِ قرآنی ہے جس سے مراد انسان کا حسی-قلبی-نفسی نظام ہے۔ یہ انسان کا باطنی نظام ہے جس میں قلبی نظام (یعنی دل و دماغ) قوتِ مُننظِمہ (Controlling Authority) کی

حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی آزادیِ فکر و عمل کی باگ ڈور قلب کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو راہ و منزل کا تعین کرتا ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اللہ اس کے قلب کو ہدایت دیتا ہے (التغابن ۶۲: ۱۱)۔ قرآن حکیم صدر کو حسی و قلبی نظام کے

مترادف کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

★ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبِهِمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِي

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الزمر ۳۹: ۲۲):

کیا جس شخص کا سینہ (حسی و قلبی نظام) اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، یعنی اُسے فعال و حرکی بنا دیا ہے، اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی میں ہے، یعنی ہدایت پر ہے، اُس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اس نور یا ہدایت سے محروم ہے؟ تو تباہی ہے ایسے لوگوں کے

لیے، جن کے قلب اللہ کے ذکر کے واسطے اکڑ گئے ہیں، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

★ **فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِإِسْلَامٍ**  
(الانعام ۶: ۱۲۵): چنانچہ اللہ جسے (اُس کی آرزوئے ہدایت کی بناء پر) ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا سینہ، یعنی حسی و قلبی نظامِ اسلام کی معنویت سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے کھول دیتا ہے۔

★ **رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي** (طہ ۲۰: ۲۵):  
اے میرے رب (یعنی آہستہ آہستہ نشوونما دے کر حدِ کمال تک پہنچانے والے) امیرِ حسی و قلبی نظام کھول دے، یعنی اُسے فعال و حرکی بنا دے۔

اسلام کے لیے شرح صدر یا کشادگی قلب کا ایک مطلب دینِ اسلام کی معنویت کا آشکارا ہونا اور قلب کا اُسے ذوق و شوق سے قبول کرنا ہے۔ یہ حقیقتِ عظمیٰ یاد رکھنا چاہیے کہ قلب میں ہدایت کی آرزو ہو تو اُسے ہدایت ملتی ہے۔ یہ قدرت کا قانونِ احترامِ آرزو ہے۔ یہ مطلب ہے **هُدًى** **لِلْمُتَّقِينَ** (البقرہ ۲: ۲) کا: **قرآن مجید متقیوں یعنی اہل آرزو و خشیت کو ہدایت دیتا ہے، یعنی انہیں جنت کی راہِ راست پر لگا دیتا ہے۔**

# صِدِّیق

صِدِّیق کے معنی ہیں : طبعاً سچ بولنے والا، جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ دوسرے لفظوں میں سچ کا اس قدر جوگر ہو کہ اس سے جھوٹ کا امکان ہی نہ ہو، نیز جو اپنے قول و اعتقاد میں سچا ہو اور سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ

(الاحزاب ۳۳ : ۲۳) :

مؤمنوں میں سے وہ (صِدِّیق) لوگ جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔

انسان کے قول و فعل کی مکمل ہم آہنگی، حُسنِ نیت و عمل، خلوصِ دل، تقویٰ، نیز کذب و باطل سے طبعاً نفرت کرنے کو صِدِّیق کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے صِدِّیق مجاہدِ حق، دشمن و نبرو آزمائے باطل اور شہیدِ حق ہوتا ہے۔

صِدِّیق، اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں میں سے ہوتا ہے جن کی رفاقت کو اللہ تعالیٰ نے حسین رفاقت سے تعبیر کیا ہے (النساء ۴ : ۶۹)۔

# صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ

قرآنِ حکیم کی رو سے، صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ اللہ سبحانہ و تعالیٰ یا اس کی جنت کی طرف جانے کی حسین و فطری اور مُسْتَقِل و پائدار راہِ راست ہے (الانعام ۶: ۱۵۳)، اور یہ قرآنِ حکیم کے احکام و تعلیمات پر عمل کرنے سے عبارت ہے!

★ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوا هَذَا صِرَاطَ مُسْتَقِيمٌ ○ (الزخرف ۲۳: ۶۴):

بے شک، اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار و آقا ہے۔ اسی کے احکام و تعلیمات پر عمل (= عبادت) کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

قرآنِ حکیم نے صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ کی کئی ایک مقام پر تشریح کی ہے، جن میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

۱- یہ تیرے رب کا حسین و راست اور قائم و دائم راستہ ہے (الانعام ۶: ۱۲۶)۔

۲- رب الناس یا بنی نوع انسان کا پروردگار بھی صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ پر

ہے، یعنی وہ سچے اور ٹھیک احکام و قوانین اور تعلیمات

دینے والا ہے (سُورۃ اٰلِ اٰمِرِیْن ۱۱: ۵۶)۔

۳- صراطِ مُستقیم سیدھا اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے (الحجر ۱۵: ۴۱)۔

۴- اِیْمَانٌ بِالْاٰخِرَةِ نہ ہو تو انسان صراطِ مُستقیم سے ہٹ کر چلتا

ہے (جو راہِ جہنم ہے) (المؤمنون ۲۳: ۷۴)۔



# صلوٰۃ

اس از بس اہم اصطلاح قرآنی کو قرآن مجید نے لغوی اور اصطلاحی دونوں مفاہیم میں استعمال کیا ہے۔  
(الف) صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں : نظامِ زندگی اور اُس پر عمل کرنے کا طریقہ۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ  
وَالطَّيْرُ صَفَّتْ كُلُّهَا قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ (النور ۲۴: ۲۴):  
کیا تو نے غور و فکر نہیں کیا کہ اللہ کی تقدیس و تہنیز کرتے  
ہیں جو بھی آسمانوں اور زمیں میں ہیں، اور پر پھیلائے  
ہوئے پرند بھی، نیز سب اپنے نظامِ زندگی اور اُس پر  
عمل کرنے کے طریقوں سے واقف ہیں۔

(ب) اصطلاح میں صلوٰۃ سے مراد پنجگانہ صلوٰۃ (نماز) ہے  
جو مسجد میں باجماعت قائم کی جاتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ حِفْظُوا عَلٰی الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوٰةِ الْوَسْطٰی قَا وَقُوْا لِلّٰہِ

فَنِتَيْنَ ۝ (البقرة ۲: ۲۳۸):

﴿مُسْلِمَانَوًا﴾ تمام نمازوں کی حفاظت کرو (یعنی اُن کے قیام کو یقینی بنا لو اور اُن کے تقاضوں کو پورا کرتے رہو) خصوصاً درمیانِ والی نماز (یعنی صلوٰۃ الفجر: اس لیے کہ بوقتِ سحر قرآن مجید اپنی معنویت کے ساتھ قلوب پر آشکارا ہوتا ہے (الاسراء ۱۷: ۷۸)؛ نیز مسلمانوں کا دن غروبِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے) اور صبر و استقامت سے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین اور تعلیمات پر عمل کرو۔

اس سے مستنبط ہوا کہ پنجگانہ نماز اور اللہ تعالیٰ کے احکامات و قوانین اور تعلیمات پر عمل لازم ملزوم ہیں۔

## صلوٰۃ کے بنیادی تقاضے:

قرآن حکیم کی رو سے صلوٰۃ کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنا ہر نمازی پر فرض ہے، اور وہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی اطاعت و بندگی نہ کرنا، دوسرے لفظوں میں، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے احکام و قوانین پر عمل نہ کرنا (صود ۱۱: ۸۷)۔

۲۔ اپنے مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف اُس کے

احکام کے مطابق خرچ کرنا؛ بخل کرنا نہ اسراف و تبذیر کرنا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ قَالُوا يُشْعِبُ صَلَوَتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَشْرِكَ مَا يَعْبُدُ  
 آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ  
 الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ○ (صُودا: ۱۱: ۸۷):

انہوں نے جواب دیا: اے شعیب! کیا تمہاری صلوة

یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی

اطاعت و بندگی ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں؛

یا ہم اپنے مال و منال کے ساتھ جیسا چاہیں تصرف نہ

کریں؟ بس تم ہی ایک عقلمند اور راستباز رہ گئے ہو!

۳- صلوة بخل اور بے حیائی، نیز ہر قسم کے ناجائز و قبیح کام

کرنے سے منع کرتی ہے۔

★ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت

۲۹: ۲۵): بلاشبہ صلوة بخل و بے حیائی اور ناجائز و

غیر فطری افعال سے منع کرتی ہے۔

۴- حکومت اور معاشرے کو عوام کے لیے بنیادی ضروریات

(= اجتماعی کفالت) کا نظام قائم کرنے کی ترغیب نہ دینا یا

اس میں حائل ہونا۔



★ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۚ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۚ  
الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۚ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ (الماعون

۱۰۷: ۴ تا ۷) :

فی الواقع اُن نمازیوں کے لیے ہلاکت و تباہی ہے، جو اپنی  
صلوٰۃ یا نماز کے تقاضوں سے غافل ہیں، یعنی ان کو پورا  
نہیں کرتے، جو ریاکاری کرتے ہیں، یعنی محض دکھاوے یا  
نیک نامی کے لیے نماز ادا کرتے ہیں، اور حاجتمند لوگوں کو  
بُنیادی ضروریات کی چیزیں فراہم نہیں کرتے یا نہیں کرنے دیتے،  
یعنی قومی کفالت کا نظام قائم نہیں کرتے یا نہیں کرنے دیتے۔  
اللہ تعالیٰ کی نظر میں حقیقی مُصلِّین وہ ہیں جو بیچگانہ صلوٰۃ  
یا نماز کو اُن کے تقاضوں کے ساتھ قائم کرتے ہیں یعنی اُن کے  
فرائض اور مقتضیات کو پورا کرتے ہیں، یہی مُصلِّین یا سچے نمازی  
بہشت کے ارفع سے ارفع تر باغوں میں عزت و آبرو کے ساتھ  
رہیں گے (المعارج، ۷۰: ۱۹ تا ۳۵)۔



# طَاغُوتُ

طَفُوتٌ وَطَغَيْتٌ، طَغَوَانًا وَطُغْيَانًا کے معنی ہیں : حد اور پیمانے سے باہر ہو جانا اور سرکشی کرنا۔ طُغْيَان کا معنی سرکشی اور نافرمانی میں حد سے زیادہ تجاوز کر جانا ہے۔ قرآن مجید میں فرعون کے متعلق آیا ہے :

★ إِنَّهُ طَغَى (طہ : ۲۰ : ۲۳) : وہ حد سے زیادہ سرکش ہو گیا ہے۔

اور قوم ثمود کے متعلق ہے :

★ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا (النجم : ۹۱ : ۱۱) : قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب (پیغمبر) کو جھٹلایا۔

الطَّاغُوتُ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حدود شکن ہو،

اور وہ ہستی یا چیز جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (المفردات)۔

طَاغُوت اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو صراطِ مستقیم سے

بہکا کر غلط راستوں پر لگا دے (لسان، محیط، تاج العروس)۔

قرآن مجید میں اللہ کے مقابلے میں الطَّاغُوت کا لفظ کئی بار

آیا ہے جو اس اصل پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد معاشرتی

سرطان یعنی فرعون و ہامان اور قارون و آزر ہیں، جو تخت و کرسی یا مسند پر بیٹھ کر خدائی کا دم بھرتے ہیں اور لوگوں کے اللہ و رب بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ **اِنَّ اَعْبُدُ وَاللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ** (التخل ۱۶: ۳۶):

فقط اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کرو، یعنی اس کے قوانین و احکام پر عمل کرو اور الطاغوت، یعنی معاشرتی سرطانوں اور معبودانِ باطلہ کی عبادت، سے اجتناب کرو، یعنی ان کا کہا مانو نہ ان کی صحبت و رفاقت میں رہو۔



## طَمَع (چھاپ)

اس کا مطلب ہے انسان کے قلبی یا باطنی نظام کا معطل و بے نور ہو جانا۔ یہ ایک قلبی (نفسیاتی) بیماری ہے۔ حق و ہدایت کو قبول نہ کرنا جب انسان کی زندگی کا چلن بن جائے اور اس کی شخصیت گناہ کے سانچے میں اس طرح ڈھل جائے کہ شرک و ظلم، فسق و فجور، کفر و منافقت اور کذب و عُدوان کے داغ اس پر واضح طور پر مُرسم ہو جائیں تو اس وقت اصطلاح قرآنی میں کہا جائے گا کہ اس کے قلب پر طمع (چھاپ) لگ گئی ہے۔

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ يَهَا ۖ وَقَدْ جَاءَتْهُمْ  
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ  
قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكٰفِرِينَ ۝ (الاعراف

۶ : ۱۰۱ :

یہ ہیں (دُنیا کی بعض) آبادیاں جن کے کچھ حالات ہم تمہیں سناتے ہیں۔ ان سب میں ان کے پیغمبر (اللہ تعالیٰ کی) واضح آیات (یعنی محکم علمی دلائل) لے کر آئے، مگر ان کے مکین ایسے نہ تھے کہ جن آیات اور واضح احکام و دلائل کو

وہ پہلے جھٹلا چکے تھے انہیں سچ مان لیں۔ اس طرح اللہ اُن کی تکذیبِ وحی و تنزیل کی پاداش میں اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق، اُن کے دل و دماغ پر چھاپ لگا دیتا ہے، یعنی ان کے باطنی نظام کو معطل کر دیتا ہے اور ان میں قبولیتِ حق کی استعداد مفقود ہو جاتی ہے۔

★ **أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصْبَنَهُم بِذُنُوبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ**

لَا يَسْمَعُونَ ○ (الاعراف، : ۱۰۰) :

کیا اُن لوگوں کو جو پہلے لوگوں کے بعد ملک کے وارث بنے ہیں، اس واقعیت سے عبرت نہیں ہوئی کہ اُن کی طرح ان کے گناہوں کی پاداش میں ہمارا قانونِ مشیت و مجازات ان کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتا ہے؟ لیکن ان کو عبرت اس لیے نہیں ہوتی کہ یہ نشہٴ تغافل میں سرشار دیکھتے ہیں نہ سُننے ہیں، (نتیجہً) ہم (اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق) اُن کے قلوب پر چھاپ لگا دیتے ہیں لہذا ان میں (حق) سُننے کی استعداد مُردہ ہو جاتی ہے۔

تکذیبِ حق کرنے والوں اور معصیت میں مبتلا لوگوں کے علاوہ منافقوں کے قلوب پر چھاپ لگ جاتی ہے (المنافقون

۶۳: اتا ۳، جس کی وجہ سے وہ شعور و فہم سے بالکل عاری ہو جاتے ہیں اور گمراہی اور محرومی ان کے نصیبوں کا لکھا بن جاتی ہے (نیز دیکھیے عنوان "امراض قلب")۔



## ظلم

ظلم کے معنی ہیں: کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حد سے تجاوز کرنا، نپیرنا انصافی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اسی بناء پر قرآن حکیم کے نزدیک شرک ظلمِ عظیم ہے (لقمان ۳۱: ۱۳)۔ ظالم ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق غصب یا سلب کر لیں۔

ظلم کی چار بڑی اقسام ہیں:

۱۔ اپنے آپ پر ظلم کرنا:

★ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ (فاطر ۳۵: ۳۲):

ان میں سے بعض اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں، یعنی اپنے آپ کو طمانیت سے محروم کر کے رہیں خوف و حزن بناتے ہیں۔

۲۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق جھوٹ بولنا:

★ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا (صودا ۱۱: ۱۸):

اور اس میں سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے،

یعنی اس کی ذات و صفات سے متعلق جھوٹی باتیں اور روایات وضع کرے۔

۳- اللہ کے بندوں پر ظلم کرنا :

★ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ (الشوریٰ ۴۲: ۴۲) : الزام تو ان لوگوں پر ہے جو بنی نوع انسان پر ظلم کرتے ہیں، یعنی ان کے انسانی حقوق غصب و سلب کرتے اور ان پر جور و جفا کرتے، نیز تضحیک و استہزاء کا ہدف بناتے ہیں۔

۴- حدود اللہ سے تجاوز کرنا :

★ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ (البقرة ۲: ۲۲۹) :

اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں، یعنی نافرمانی کریں، وہی ظالم ہیں۔





# عبادت

عبد کے معنی ہیں غلام۔ ایک آقا کو وہ غلام زیادہ پسند ہوتا ہے جو اُس کے احکام پر خوش دلی سے عمل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور حکم عدولی نہیں کرتا۔

احکامِ الہیہ سے مراد قرآنِ حکیم کے اعتقادات، تعلیمات، قوانین اور اوامر و نواہی ہیں، جن پر حقیقی المقدور، بہ رضا و رغبت، عمل کرنے کی کوشش کرتے رہنا عبادت ہے۔

عبادت یعنی احکامِ الہیہ پر عمل، اللہ تعالیٰ کی نصرت و فتح کی دُعا مانگنے کی پیش شرط ہے، جیسا کہ اس آیہ فکر انگیز سے ثابت ہوتا ہے :

★ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ (الفاتحہ ۱: ۵) :

ہم تیری ہی عبادت یعنی تیرے قوانین و احکام اور اوامر و نواہی پر عمل کرتے ہیں اور فقط تجھ ہی سے نصرت و مدد مانگتے ہیں۔



# عدل و احسان

عدل کے معنی ہیں دوسروں کا حق پورا پورا دینا۔ احسان  
 یہ ہے کہ ان کو ان کے حق سے زیادہ دینا تاکہ وہ خوش ہو جائیں۔  
 قرآن مجید کا ارشاد ہے :

★ **إِنَّ مَعَ الْعِلْمِ لَعَذَابٌ أَلِيمٌ** ﴿۱۰۱﴾  
 اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

عدل حق و صداقت کو اور احسان عدل کے ساتھ اپنا رو  
 قریب کو پہنچانا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو، انسان بحکمِ ربِّ رحمن  
 دوسروں کے ساتھ عدل و احسان کرنے کا مکلف ہے۔  
 (دیکھیے احسان صفحہ ۲۲)۔



# عذابِ قبر

اس سے مراد عذابِ برزخ ہے۔ اسے واضح طور سے سمجھنے کے لیے اس اصلِ عظیم کو ذہن نشین کر لینا ناگزیر ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے ہر انسان مرنے کے بعد صرف قیامت کے روز ہی دوبارہ زندہ کیا جائے گا (النساء ۴: ۸۷، الاسراء ۱۷: ۱۳، طہ ۲۰: ۱۲۴، العنکبوت ۲۹: ۲۰) و بمواضع کثیرہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کی لذت سے آشنا ہونے کے بعد نفسِ انسانی قیامت تک عالمِ برزخ میں رہے گا، جیسے وہ عالمِ خواب میں رہتا ہے۔ اگر وہ نفسِ مطمئنہ ہوگا تو عالمِ کیف و سرور میں اس طرح زندگی کرے گا جس طرح وہ حسین خواب میں کرتا ہے۔ بخلاف اس کے، اگر وہ آتش بداماں نفس ہوگا تو وہ عالمِ رویا میں خوف و حزن کی آتش سوزاں کے عذاب میں ہوگا۔ اسے عذابِ قبر سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَمِنْ قَدَرِ آيَاتِهِم بَرَزَخُ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ○ (المؤمنون ۲۳: ۱۰۰) ان کے سامنے (عالمِ) برزخ ہوگا جس میں وہ دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک (رہیں گے)۔

# عذابُ النار

یہ اصطلاح وسیع المعانی ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں ”آگ کا عذاب“۔ ایک آگ ہوتی ہے خوف و خطر اور غم و اندوہ کی، جو دنیا میں کفر و شرک، غضب و سلبِ حقوقِ انسانی، نیز ہر قسم کے جرم و گناہ کے اثرات سے دل کو لگتی ہے اور اُسے اہلِ نار یا سمندرِ سرشت بنا دیتی ہے۔

دوسری آگ آخرت میں جہنم کی ہوگی، جس میں مجرم ڈالے جائیں گے۔ یہ آگ ان کے تن من کو جلائے گی، جس کی طرف قرآن مجید نے بلیغ اشارہ کیا ہے :

★ نَارُ اللَّهِ الْمَوْقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئِدَةِ ۝ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

(الہمزہ ۱۰۴: ۶ تا ۹):

یہ اللہ کی بھڑکانی ہوئی آگ ہے جو ان کے قلوب (یعنی دل و دماغ) کو گھیر لے گی اور وہ آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں مقید ہوں گے، یعنی جہنم میں مجرم آگ کے اندر ہوں گے اور آگ ان کے اندر ہوگی۔

## العَفْوُ

اس ازلیں اہم اصطلاح کے معانی ہیں : وہ مال و متاع جو انسان کے پاس حُسنِ ضرورت سے زیادہ ہو اور تجزیوں یا بینکوں وغیرہ وغیرہ میں بند ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ فالتو دولت جو گردش میں ہونے کے بجائے ناکارہ و بانجھ ہو۔ انگریزی میں العفو کی اس طرح تعریف کر سکتے ہیں :

Surplus wealth or capital which is idle and shy

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلِ الْعَفْوَ ط (البقرة ۲: ۲۱۹):

اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا یا کتنا (مال و منال) اللہ

کی راہ میں خرچ کریں۔ (میرے نبی!) کہہ دیجیے کہ جو فالتو

ہو (یعنی جو مال و متاع حُسنِ ضرورت سے زیادہ ہو اور

گردش میں نہ ہو) اُسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر فالتو مال و

دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے تو وہ انسان کے

پاس جمع ہوتا جائے گا اور دولت کو جمع کر کے رکھنا بخل اور

حرامِ مُطلق ہے۔ چنانچہ، دولت جمع کر کے رکھنے والوں کو جہنم کے شدید عذاب کی وعید دی گئی ہے (التوبة ۹: ۳۴، ایل ۹۲: ۸ تا ۱۱، الهمزة ۱۰۴: ۹) و بموضع کثیرہ۔

اسلامی معاشرے میں اگر کوئی فرد ضرورت سے زائد مال و متاع معاشرے یا حکومت کو واپس نہ کرے تو مسلم حکومت کی یہ ذمے داری ہے کہ فالتو مال و دولت اُس سے زکوٰۃ کی طرح قانوناً وصول کرے اور افرادِ معاشرہ کی کفالت اور فلاح و بہبود، اسلام کی تبلیغ، قرآن مجید کی تعلیم اور ملک کے دفاع اور ترقیاتی کاموں پر خرچ کرے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ○

(الاعراف ۱۹۹) :

(اے نبی!) لوگوں سے (حُسن) ضرورت سے زیادہ

مال و دولت کو زکوٰۃ کی طرح قانوناً لے لو۔ اور حسین

کاموں کے کرنے کا حکم دیتے رہو اور جاہلوں کی بات نہ

سنو (جو العفو کے متعلق لایعنی و باطل گفتگو کرتے ہیں)۔

یاد رہے کہ قرآن مجید نے ”العفو“ کو معافی یا درگزر کے

معانی میں کہیں استعمال نہیں کیا، لہذا یہاں اس کے معافی

مُعَانِي یا درگزر کرنا درست نہیں۔ دوسرے، اس آیت بصیرت افزا کے سیاق و سباق کے لحاظ سے بھی خُذِ الْعَفْوَ کے وہی معانی ہیں جو اوپر دیے گئے ہیں۔

العفو، علامہ اقبالؒ کی نظر میں :

جو حرفِ قُلِّ الْعَفْوِ میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(ضربِ کلیم)



# عمی القلوب

یہ ایک قلبی (یا نفسیاتی) بیماری ہے۔ انسان جب غفلت و جہالت میں ڈوب جاتا ہے تو وہ حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرتا، جس کی وجہ سے اس کے قلب کی فعلی اور انفعالی قوتیں مسلوب ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے فطری حُسن اور نورِ بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قلب کی اس حالت کو قرآن حکیم نے ”قلب کے اندھا پن“ سے تعبیر کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ حق کو اور حُسن کو اور بن جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُون لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ  
بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا، فَإِنَّهَا لَا تَعْيَى الْأَبْصَارُ  
وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج ۲۲: ۴۶):

کیا ان لوگوں نے زمین میں با مقصد سیر و سیاحت نہیں کی کہ عبرت حاصل کرتے، ان کے دل و دماغ سمجھنے، پوچھنے اور کان سُننے کے قابل ہو جاتے یعنی ان کے قلوب سلیم اور گوش حق نبوش ہو جاتے۔ (واقعہ یہ ہے کہ



آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں، بلکہ قلوب اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

قلب نابینا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان حُسن کو اور حق کو ہو جاتا ہے۔ بدیں وجہ، وہ زندگی کے واقعات اور حوادثِ زمانہ کو دیدہٴ عبرت نگاہ سے دیکھنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسے حق کو لوگ کلامِ الہی کے حُسنِ معانی کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ لہذا وہ قیامت کے روز نابینا اٹھیں گے اور اسی حالت میں انہیں دھکیل کر دوزخ میں ڈالا جائے گا (ظہ ۲۰: ۱۲۴ بعد)۔



## عہد

عہد کا مطلب ہے قول و قرار، پکا عہد و پیمان (Covenant)۔  
 قرآن حکیم نے عہد کو میثاق کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا  
 ہے (دیکھیے عنوان ”میثاق“)۔  
اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد:

★ وَالَّذِينَ يَبْقِضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ (الرعد ۱۳: ۲۵):  
 اور جو لوگ اللہ سے پکا عہد (Covenant) کر کے اُسے ٹوڑ دالتے ہیں۔

اور

وَ أَوْفُوا بِعَهْدِكُمْ (البقرة ۲: ۴۰):  
 تم مجھ سے کیا ہوا اپنا عہد پورا کرو، میں (اللہ تعالیٰ) تم سے کیا ہوا اپنا عہد پورا کرونگا۔  
آپس میں عہد:

★ وَ أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (الاسراء ۱۷: ۳۴):  
 اور قول و قرار کو پورا کرو، یقیناً قول و قرار کے بارے میں  
 (قیامت کے روز) پوچھ گچھ ہوگی۔

انسان کے لیے عہد کو پورا کرنا لازم ہے۔ عہد توڑنے والوں پر  
 اللہ تعالیٰ نے لعنت بھیجی ہے۔ اور انہیں (عذاب کی) سخت  
 وعید دی ہے (الرعد ۱۳: ۲۵)۔

## عَمْرٌ (غفلت و جہالت)

یہ ایک قلبی (پانفسیاتی) بیماری ہے۔ انسان کے دل و دماغ پر جب ایک مُدّت تک شرک و کفر اور ظلم و جہل کا پردہ پڑا رہے تو اسے حُسن و حق کا احساس رہتا ہے نہ شعور۔ نتیجتاً، وہ حُسن کور و حق کور اور تغافل شعار بن جاتا ہے۔ اس نفسیاتی بیماری کو قرآن حکیم نے عَمْرٌ یعنی غفلت و جہالت سے تعبیر کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ **وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظَاهِمُونَ** ○ بَلْ

قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِّنْ هَذَا وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّنْ دُونِ

ذَلِكَ هُمْ لَهَا عَمَلُونَ ○ (المؤمنون ۲۳ : ۶۲ - ۶۳) :

اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو حقیقت بیان کرتی

ہے اور لوگوں کے ساتھ کبھی نا انصافی نہیں ہوتی۔

(حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دل و دماغ اس (قرآن)

سے غفلت و جہالت میں پڑے ہوئے ہیں اور اس

غفلت شعاری کے علاوہ ان کے اور بھی اعمال (سوء)

ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

اس غفلت و جہالت کا انسان کی نفسیاتی کیفیات پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ دین و حیات کے مسائل کو علم کی روشنی کے بجائے ظن و تخمین سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، وہ کامرانی حیات کی حسین راہِ راست کو کھو کر غلط راہوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ قُتِلَ الْخُرَّصُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ ۝

(الذَّٰرِيَاتُ ۵۱ : ۱۰-۱۱) :

انکلیں دوڑانے والے مارے گئے، وہ غفلت و جہالت میں ڈوبے ہوئے حقیقت سے بے خبر ہیں۔  
ایسے تغافل پیشہ لوگ ہی گمراہ اور اہلِ نار ہوتے ہیں۔



# غیب

غیب کے لغوی معنی ہیں : پوشیدہ، مخفی، غیر مرئی، حسی مشاہدے یا مدرکہ کی رسائی سے دور۔ اصطلاحِ قرآنی میں اس کے یہ بھی معانی ہیں : اللہ سبحانہ و تعالیٰ، اُس کے ملائکہ، عالم برزخ اور آخرت یعنی قیامت، روزِ حساب و جزاء، جنت و دوزخ نیز وہ تمام حقائق جو نوید یا وعید کی صورت میں ہیں، ان سب پر ایمان لانا فرض ہے۔

یہ اصلِ عظیم یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کی کُل مخلوقات مشہود ہیں، غیب یا پوشیدہ نہیں۔ غیب صرف انسان و جن، ملائکہ وغیرہ وغیرہ کے لیے ہے۔

قرآن حکیم اگرچہ ہر زمان و مکان کے بنی نوع انسان کے رشد و ہدایت کے لیے ہے، لیکن ہدایت صرف متقیوں کو دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی غیر مرئی باتوں کو تسلیم بالیقین کرتے ہیں :

★ ذَالِكِ الْكِتَابِ لَارْتِيْبٌ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ۝ (البقرة ۲ : ۲-۳) :

یہ کتابِ الہی یعنی قرآنِ حکیم جس کے من جانب اللہ اور سچا ہونے میں شک و اضطراب کی قطعاً گنجائش نہیں، مُتَّقِیوں یعنی اُن لوگوں کو راہِ راست دکھاتا ہے، جنہیں اس کی طلب و جستجو ہوتی ہے، اور وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں، یعنی غیر مرئی حقائق و واقعات کو تسلیم بالیقین کرتے ہیں۔

غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں (النحل ۲۷)؛  
 ۷۵ اور اس حقیقت کا اعتراف اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اعظم و  
 آخرِ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ صدق سے اس طرح کرایا ہے :  
 ★ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ  
 (صُورۃ ۱۱ : ۳۱) : اور میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ  
 کی نعمتوں کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا  
 ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو نہ ماننا اور آپ  
 کو عالمِ الغیب سمجھنا، آپ کی اور قرآنِ حکیم دونوں کی تکذیب  
 ہے، جس سے کفر لازم آتا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد  
 ہوتا ہے :

★ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (المؤمنون

۲۳: ۹۲: ”وہ“ غیب یعنی غیر مرئی و غیر محسوس اشیاء اور حال و ماضی اور مستقبل و آخرت کے احوال و ظروف کا بھی علم رکھتا ہے اور مرئی و محسوس اشیاء کے احوال و ظروف کا بھی۔ دیکھو! (یہ مُشْرک لوگ) جو مُشْرک کرتے ہیں یعنی مُشْرکِ کَانہ باتیں اور کام کرتے ہیں، اُن سے ”وہ“ پاک و مُنَزَّہ ہے۔

اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ کسی نبی یا برگزیدہ، مستی سے متعلق یہ کہنا کہ وہ غیب کا علم رکھتا ہے یا رکھتا تھا، مُشْرک ہے، اور ایسا عقیدہ رکھنے والے مُشْرک ہیں۔



# فاسق

جو لوگ اللہ کے ساتھ مضبوط عہد و پیمانہ کر کے فسخ کر دیتے اور جن باتوں، یعنی صلہ رحمی، قول و قرار، حلف و سوگند وغیرہ وغیرہ کو برقرار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، کو توڑتے ہیں، یا جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، یعنی حیات اجتماعیہ کا توازن بگاڑتے ہیں اور ان میں بے نظمی و ناہمواری پیدا کرتے ہیں، ان کو اصطلاح قرآنی میں فاسق کہتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

★ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ  
مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ  
وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۝

(البقرة ۲: ۲۶-۲۷)

دیکھو! وہ یعنی اللہ اپنے قانونِ معذرت و مشیت کے مطابق اس سے فاسقوں کے سوا کسی کو گمراہی میں بھٹکنے نہیں دیتا۔ (اور فاسق لوگ) وہ ہیں جو اللہ سے (بذریعہ کلمہ طیبہ) عہد و پیمانہ کر کے توڑ دیتے ہیں اور



اُن (مُعاہدوں اور رشتوں کو) مُنقطع کر دیتے ہیں، جن کو اُستوار رکھنے کا اللہ نے قطعی حکم دیا ہے، اور اس طرح وہ دُنیا یا مُلک میں بد نظمی و برہمی پیدا کرتے ہیں۔ یہی لوگ حسنات کے لحاظ سے خسارے میں رہتے ہیں (یعنی دُنیا میں حیاتِ طیبہ اور آخرت میں جنت سے محروم رہنے والے ہیں)۔



# فحشاء

اس اصطلاح کا مطلب ہے : بے حیائی اور بخل  
(Lewdness and stinginess)۔ (۱) بے حیائی کے معانی ہیں :  
جسم فروشی، فحش حرکات، جنسی مُحَرَّکات و افعال وغیرہ وغیرہ  
(ب) بخل۔ عربوں کے نزدیک بخل بھی بے حیائی ہے۔ اصطلاح  
میں اس کے معنی ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا۔

(۱) جنسی بے راہ روی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِدَا وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ (یوسف: ۲۴):

اس نے یعنی عزیزِ مصر کی بیوی نے ہم آغوشی کی خاطر  
اُس (یوسفؑ) کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا، اگر (یوسفؑ)  
اپنے رب کی دلیل (یعنی گناہ کو اُس کی اصل گھناؤنی شکل  
میں) نہ دیکھ لیتے تو وہ اس کی طرف جھک جاتے (لیکن  
انہوں نے گناہ کو اس کی انتہائی گھناؤنی شکل میں دیکھا تو  
وہ عزیزِ مصر کی بیوی سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے)۔ اس  
طریقے سے ہم نے اُسے بے حیائی کے اندوہناک اور  
گھناؤنے فعل سے بچالیا۔

علاوہ ازیں، جنسِ فروشی، ضمیر و قومِ فروشی، سمگلنگ،  
منشیاتِ فروشی یا قمار بازی وغیرہ وغیرہ سب کامِ فحشاء کے  
ضمن میں آتے ہیں۔

(ب) بُخْل کے معنی میں۔ ارشاد ہوتا ہے :

★ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ  
وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ

عَلِيمٌ (البقرة ۲: ۲۶۸) :

شیطان (ابلیسی ہو یا بشری) تمہیں (طرح طرح کے  
خطرات سے) خوف دلاتا رہتا ہے کہ (اگر تم اللہ کی  
راہ میں زکوٰۃ، عشر، العفو، الماعون، قرضِ حسنہ وغیرہ  
وغیرہ دو گے تو تم مفلس و محتاج ہو جاؤ گے اور اس  
پناء پر تمہیں فحشاء (دولت جمع رکھنے اور اللہ کی راہ  
میں خرچ نہ کرنے) کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ لیکن (بخلاف  
اس کے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے صلے میں) اللہ اپنی  
طرف سے تمہیں (مفلسی و محتاجی وغیرہ کے خطرات سے  
تخفظ فراہم کرنے اور احسانِ فراواں سے نوازنے کی) بشارت دیتا  
ہے۔ اور اللہ (اپنی رحمت و مغفرت اور مہبت و عطا میں) بے انتہا  
وسعت رکھنے والا۔ کل موجودات کا علیم کلی رکھنے والا ہے۔

# فرعون

یہ قرآنی تمبیحات ( Historical Symbols ) میں سے ہے۔ اس کی مختصر اصراحت کی جاتی ہے :

یہ علامت ہے مُتکِبِّر و سرکش حکمران کی جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے بجائے اپنے احکام سے رعایا پر حکومت کرتا اور اُن کا استحصال کرتا ہے، نیز وہ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے رحمانی اداروں کو قائم نہیں کرتا، نہ کرنے ہی دیتا ہے، بلکہ اپنی حکومت کو مضبوط رکھنے کی خاطر شیطان کے ہامانی، قارونی اور آزری ادارے قائم کرتا ہے، نتیجتاً لوگوں کو اُن کے بنیادی انسانی حقوق ( Fundamental or Human Rights ) یا حقوق العباد سے محروم کر کے اُن کے لیے راہِ مستقیم پر چلنا ناممکن بنا دیتا ہے۔



# الْفُرْقَان

اس کے لغوی معنی ہیں : ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کر دینا اور الگ کر دینا (ابن فارس)۔ الفاروق ؛ وہ بدلی جو دوسری چھائی ہوئی بدلیوں سے الگ ہو کر برے سے (تاج العروس) ، نیز کسوٹی جو کھوٹے کھرے کے فرق کو واضح کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو "الفرقان" کے نام سے موسوم کیا ہے ، کیونکہ یہ ایمان و کفر ، توحید و شرک ، حق و باطل ، ہدایت و ضلالت اور عدل و ظلم کو صاف صاف واضح کر کے دکھاتا ہے :

ارشاد ہوتا ہے :

★ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ (آل عمران ۳: ۴) :

اور (اللہ نے) حق و باطل میں فرق کرنے والا (یعنی قرآن)

نازل کیا۔

قرآن مجید کو الفرقان کہنے کا مطلب ہے کہ یہ صیرفی حق و باطل ہے ، لہذا اس کا ہر فیصلہ قول فیصل اور حرفِ آخر کی

حیثیت رکھتا ہے، اس بناء پر قرآن مجید پر ایمان رکھنے والوں کو  
 دینی مسائل، قرآن حکیم کی آیات یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین و احکام  
 اور تعلیمات کے افہام و ادراک کے لیے قرآن عظیم کے علاوہ  
 روایات وغیرہ وغیرہ کی قطعاً حاجت نہیں۔



# فساد

فساد کی ضد اصلاح اور مُفسد کی مُصلح ہے۔ قرآن مجید نے فساد کو اصلاح کی ضد یا نقیض (Contrary) کے طور پر مُتعدد معنی میں استعمال کیا ہے۔ فساد کی بڑی بڑی اقسام یہ ہیں : قلبی، بدنی، سیاسی، عمرانی، معاشی یا اقتصادی، مذہبی، اخلاقی، علمی اور ثقافتی فساد یا بے نظمی و برہمی۔ ان معنی میں ہر وہ شخص مُفسد ہے جو زندگی کے کسی گوشے یا شعبے میں اس کے نظم و ضبط اور اعتدال و توازن کو بگاڑ دے، یعنی اس میں خرابی و برہمی، بے نظمی و نا آہنگی اور انتشار و افتراق پیدا کر دے۔

قرآن حکیم نے اپنے حُسنِ معمول کے مطابق اس اصطلاح کے معانی کی خود ہی صراحت بھی کر دی ہے، جیسا کہ اُس نے اس آیت میں مُفسد کو مُصلح کے مقابل میں لا کر اس کے مفہوم کی تفسیر کر دی ہے :

★ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرة ۲ : ۲۲۰) :  
اور اللہ تعالیٰ کو اس حقیقت کا علم ہے کہ نظامِ زندگی میں برہمی و خرابی پیدا کرنے والا کون ہے اور اس میں

توازن و ہم آہنگی پیدا کرنے یعنی اصلاح کرنے والا  
کون ہے۔

اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ فساد و اصلاح کی  
حقیقت معلوم کرنے کا معیار یا کسوٹی اب صرف اللہ تعالیٰ کا  
آخری کلام یعنی قرآن حکیم ہے۔





## فلاح

فلاح کے لغوی معنی ہیں : پھاڑنا یا شق کرنا، مثلاً کھیت میں ہل چلا کر زمین کو شق کرنا، دانہ رُوئیدہ کا جوشِ نموسے زمین کو پھاڑنا، پھاڑ کر نکلنا، نشوونما پانا اور بار آور ہونا۔

اس کے اصطلاحی معنی ہیں : دُنیا میں عذابِ النار سے نجات پا کر مسرت و اطمینانِ قلب حاصل کرنا اور آخرت میں آتشِ جہنم سے نجات پا کر جنتِ قمرۃ العین کے عالمِ کیف و سرور میں زندگی کرنا اور معنوی ترقی کرتے رہنا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۝ (الاعلیٰ ۸۷ : ۱۴) :

جس شخص نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا، یعنی اسے پاک و صاف کر کے حسین و مُنور اور فعال بنا یا، وہ اپنے جرم و گناہ کے سلبی اثرات یا سپات سے نجات پانے میں کامیاب ہو گیا (یعنی اندھیروں کو پھاڑ کر روشنی میں آ گیا)۔

فلاح پانے والے لوگ کون کون ہیں، اس کے لیے دیکھیے

المؤمنون ۲۲ : اتا ۱۱۔

# فَوْزِ عَظِيمٍ

فوز کا مطلب دُہرا ہے : ایک تو مُصیبت سے چھٹکارا پالینا، دوسرے نشوونما پانے اور ترقی کر کے کامیابی حاصل کر لینا۔ اس اصطلاحِ قرآنی میں خوف و حُزن کے عذابِ النار سے نجات پانے، نشوونما پانے، ترقی کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

چنانچہ رضوانُ اللہ پانے کو قرآنِ حکیم نے عظیم کامیابی سے تعبیر کیا ہے :

★ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

(التوبة ۹: ۷۲) :

اور اللہ کی خوشنودی یا رضامندی سب سے بڑی نعمتِ حسنہ ہے، یہ عظیم الشان کامیابی ہے۔



# قارون

یہ قرآن کی تلمیح (Historical Symbol) ہے۔

یہ علامت ہے ممتکبر و مُفسد اور قوم فروش و بخیل طبقے کی۔  
یہ استحصالی۔ سرطانی طبقہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں،  
سرداروں، نوابوں، راجاؤں، سودی سرمایہ کاروں اور سود خوروں  
پر مشتمل ہوتا ہے، نیز یہ طبقہ فرعونی حکومت کا پشتیبان ہوتا ہے۔



## قانونِ مکافاتِ عمل یا قانونِ مجازات

قدرت کا قانون ہے کہ ”جیسا کرو گے ویسا بھرو گے“۔  
 رَبُّ الْعَالَمِينَ نے انسان کو ارادہ و اختیار اور عمل و انتخاب  
 کی آزادی دے کر اس امتحانِ گاہِ دُنیا میں بھیجا ہے؛ ساتھ ہی  
 اُسے اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کا مُکلف بنایا ہے۔ اس کا مطلب  
 ہے کہ وہ ارادہ و عمل میں تو خود مختار ہے لیکن اپنے اعمال کے  
 حُسن و قبح کے مطابق اچھے یا بُرے نتائج بھگتنے پر مجبور ہے۔

انسان کے اعمال کا ہر گھڑی مُحاسبہ ہوتا رہتا ہے اور اس  
 کی جزا و سزا اس دُنیا میں فی الفور ملتی رہتی ہے (البقرة ۲: ۲۰۲)۔  
 اچھے اعمال کا صلہ قلبی حسنہ یا مسرت و اطمینانِ قلب ہے اور  
 بُرے اعمال کا بدلہ، سِیئۃً یا آتشِ خوف و حُزن ہے، جو دلوں کو  
 مُجیط ہو جاتی ہے۔ کُل اعمال کی آخری سزا یا جزا، روزِ حساب و جزا  
 (یومِ الدین) کے بعد جنتِ قُرۃ العین یا آتشِ دوزخ کی شکل میں  
 ملے گی (البقرة ۲: ۲۰۰ تا ۲۰۲)۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (المدثر ۴: ۳۸):

ہر انسان اپنے اعمال کے نتائج، حسنات و سیئات کا مرہون ہے۔

# قدر (Value = تقدیر)

قدر اور تقدیر کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی کسی شے کے اندازے کا واضح کر دینا۔ اس کے معنی قدرت (یعنی قوت و تاثیر) کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کی تقدیر دو طرح کی ہے، ایک تو اُن کو قوت و تاثیر عطا کرنا، دوسرے اُن کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص اندازے اور وجہ پر بنانا۔

خط کشیدہ عبارت کا مطلب یہ ہے کہ قدر کی دو قسمیں ہیں، ایک صوری یا خارجی، دوسری معنوی یا داخلی۔ خارجی قدر سے مراد یہ ہے کہ اُس شے کی شکل و صورت اس کے داخلی اور خارجی ماحول کے عین مطابق، یعنی ہر اعتبار سے متناسب و متوازن ہے۔ مختصراً یہ کہ قدر کے معنی کسی شے میں تناسب و ہم آہنگی اور موزونیت کے ہیں۔ یہ موزونیت اگر داخلی ہوگی تو اُسے حسن سیرت کہیں گے اور اگر خارجی ہوگی تو حسن صورت سے تعبیر کریں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

★ وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ (الانعام ۶: ۹۱):

اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کو کامل طور پر نہیں پہچانا

جیسا کہ پہچاننے (اور ماننے) کا حق ہے۔

★ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان ۲۵: ۲۶):

اور اس نے ہر شے کو تخلیق کیا اور اس میں صحیح تناسب اور وزن پیدا کیا۔ بالفاظِ دیگر، اس نے اپنی تمام چیزوں میں کامل ہم آہنگی و موزونی پیدا کی۔

★ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر ۵۴: ۴۹):

بلاشبہ ہم نے ہر شے کو صحیح تناسب اور وزن کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

اسے قرآن حکیم نے تقدیرِ الہی سے تعبیر کیا ہے (حم السجدة

۴۱: ۹-۱۲)



# قُرْبِ اِلٰہی

یہ نہایت فکر انگیز اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں :

”اللہ تعالیٰ کے قریب ہونا۔“

قرآن حکیم کی رو سے اللہ تعالیٰ تو ہماری رگِ جاں سے بھی نزدیک تر ہے تو پھر قُرْبِ اِلٰہی کا مطلب کیا ہوا ؟

اسے سمجھنے کے لیے اس اصلِ عظیم سے آگاہ ہونا ضروری ہے کہ قُرْبِ اِلٰہی کی نوعیت زمانی ہے نہ مکانی، یعنی نہ وقت کے حساب سے قریب ہے نہ فاصلے کے حساب سے قریب بلکہ مابعد الطبیعی ہے اور اس کا تعلق انسان کے نورِ ذات کے اتمام اور ترفعِ درجات سے ہے۔ نورِ ذات اصلاً ارتقائی ہے اور یہ انسان کے عشقِ اِلٰہی پر اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت اور انسان سے محبت و شفقت پر دلالت کرتا ہے۔

قُرْبِ اِلٰہی کا وسیلہ عشقِ اِلٰہی ہے۔ اہلِ عشق و وفا ہی اُس کے بندگانِ تسلیم و رضا اور دوست ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت قرآن مجید نے اپنے اعجاز و ایجازِ بلاغت سے ان

دو لفظوں میں بیان کر دی ہے :

★ السجدة وَالسُّجُودُ وَاقْتَرَبَ (العلق ۹۴: ۱۹) :

اور اللہ تعالیٰ کی عاشقانہ انداز میں فرمانبرداری کرتے رہو  
اور قریب آتے رہو (یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے درجات  
بلند سے بلند تر کرتا رہے گا اور تمہیں اپنا منظور نظر بنا  
لے گا)۔





# قُرَّةُ الْعَيْنِ

اس کا معنی ہے آنکھوں کی ٹھنڈک۔

قرآن مجید نے جنت کو قُرَّةُ الْعَيْنِ سے تعبیر کیا ہے، جو انسان بلکہ ہر متنفیس کے بصری و سمعی مشاہدے سے مخفی ہے کسی انسان جن، فرشتے یا کسی اور زندہ مخلوق نے جنت سماوی کو نہ تو دیکھا ہے اور نہ وہ اس کی ماہیت کا علم ہی رکھتا ہے؛ نیز نہ کوئی اس کا تصور ہی کر سکتا ہے۔

★ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا

كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ (السجدة ۳۲ : ۱۷) :

کوئی متنفیس یہ حقیقت نہیں جانتا کہ ان کے لیے کسی آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی جنت) چھپا کر رکھی ہوئی ہے، جو اس کے حُسنِ عمل کا نتیجہ ہے۔

باری تعالیٰ نے صالحہ بیوی اور صالح اولاد کو بھی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے (الفرقان ۲۵ : ۷۴)، جنہیں دیکھ کر آدمی کا دل مسرت و طمانیت حاصل کرتا ہے۔

# قرین

قرین کے معنی ہیں: رفیق۔ ہمزاد، ہم جلیس، ہم صحبت یا ہم عمر۔ قرآن حکیم میں ہے: ”اُن میں سے ایک کہے گا: دُنیا میں میرا ایک ہم جلیس و رفیق تھا“ (الصُّفَّت ۳۷: ۵۱)۔ قرآن حکیم نے قرین کا لفظ اصطلاحاً فرشتے اور شیطان کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے جو دُنیا میں انسان کے ساتھی ہوتے ہیں۔

مثلاً فرشتے کے معنی میں؛ ارشاد ہوتا ہے:

★ وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَىٰ عَيْنَيْكَ ۖ (ق: ۵۰: ۲۳):

اس کے ساتھی (فرشتے) نے عرض کیا: یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔

اور شیطان کے معنی میں:

★ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۖ

(ق: ۵۰: ۲۷):

اُس کے ساتھی (شیطان) نے عرض کیا: ہمارے پروردگار و

مالک! ہم نے اسے سرکش نہیں بنایا، بلکہ یہ خود پر لے درجے

کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔

مُحَوَّلَةٌ بِالْآيَاتِ جَلِيلَةٍ سَاطِرَةٌ مَّا كَرِهَ آدَمِيُّكَ دُوْبِيْدَةُ قَرِينٍ هُوْتَةٌ هِيَ:

ایک فرشتہ اور دوسرا شیطان (نیز دیکھیے النساء: ۴۸، الزخرف: ۴۳: ۳۶)۔

# قِسَاوَات

قِسَاوَاتِ قرآنِ حکیم کی بیان کردہ قلبی (یا نفسیاتی) بیماریوں میں سے ایک ہے۔ یہ ضد ہے سعادت کی۔ قلبِ فِطْرَةٌ حسین و سعید ہوتا ہے، اور سعادت عبارت ہے نرم دلی، درد مندی، اور صاحب دلی سے۔ سعادت کی بدولت قلب میں حُسن و حق کو قبول کرنے کی استعداد پائی جاتی ہے۔ انسان کے قلب (دل و دماغ) میں اعمالِ سُوء کے سبب سعادت نہ رہے تو وہ مریض ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں، اس میں سختی اور درشتی پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں قبولیتِ حق کی استعداد مفلوج ہو جاتی ہے، جسے قرآنِ حکیم نے قِسَاوَات سے تعبیر کیا ہے :

★ كَذٰلِكَ يُخَيِّئُ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝  
 ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ  
 قَسُوَةً (البقرة ۲: ۷۳، ۷۴) :

اللہ تعالیٰ اس طرح مُردوں کو زندگی بخشا ہے اور تمہیں اپنی (قُدْرَت و حکمت کی) اعجازی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ مگر ایسی اعجازی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی تمہارے

قلوب (دل و دماغ) سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے۔

گویا ہر منظرِ فطرتِ انسان کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی نشانیوں میں غور نہیں کرتے ان کے دل و دماغ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، یعنی ان میں عبرت پذیری اور قبولیتِ حق کی استعداد نہیں رہتی۔

قرآن حکیم نے فسق (یعنی عدل و احسان کی راہ سے ہٹ جانا) کو بھی قساوتِ قلبی کا ایک سبب بتایا ہے (الحدید ۵۷: ۱۶)۔



# قلب

”قلب“ کو قرآن حکیم نے دل اور دماغ کے نظاموں پر مشتمل ایک نظامِ کُلّی کے مفہوم میں اصطلاحاً استعمال کیا ہے۔ قلب کا مترادف دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ اسے انسان کے باطنی نظام سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

قلب ایک حسین و منیر اور زندہ و خود کار نظام ہے، جو آزاد و خود اختیار ہے اور اپنے اندر دو سائنٹیفک نظام رکھتا ہے، جسے دل اور دماغ کہتے ہیں۔

دل، قلب کا ایک جزو لاینفک (اٹوٹ انگ) ہے، لیکن اس کا اپنا جداگانہ نظام بھی ہے جو جمالیاتی حس (Aesthetic Sense)، ضمیر (Conscience) اور وجدان (Intuition) پر مشتمل ہوتا ہے۔ دل خواہشات و عصبیات اور جذبات و احساسات کا منبع ہے۔

قلب کا دوسرا نظام دماغ بھی بہت سی اہم قوتوں کا خزانہ ہے۔ اس کے اجزایہ ہیں : عقل، مفکرہ، حافظہ، واہمہ، متخیلہ اور متصورہ۔

قلبِ احسن الخالقین کا تخلیقی مُعجزہ ہے۔ یہ ایک نامیاتی کُل ہے، جو انسان کے حسی اور نفسی نظاموں سے لاینفک رابطہ رکھنے کے باوجود آزاد و خود اختیار ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝ (ق ۵۰ : ۳۷) :

بے شک ہر اس شخص کے لیے اس میں سامانِ عبرت ہے، جس کے پاس قلبِ سلیم یا گوشِ حق نبویش ہو، اور جو توجہ سے بات کو سنے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

★ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُون لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ (الحج ۲۲ : ۴۶) :

کیا ان لوگوں نے دنیا میں بامقصد سیاحت نہیں کی کہ ان کے قلوب ایسے ہو جاتے کہ عقل و فکر سے کام لیتے اور کان ایسے ہو جاتے کہ ان سے حق بات سُنتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ قلوب جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے نواد (جمع اَفِيدَة) کو قلب کے مترادف کے

طور پر استعمال کیا ہے۔

انسان کے سینہ میں موجود ایک لطیفہٴ غیبی ہے (آل عمران ۳: ۱۵۴)، جو اللہ تعالیٰ کی روحانی ایجاد یعنی ”امر“ میں سے ہے (الاسراء ۱۷: ۸۵)، اور قرآن حکیم اُسے ”نفس“ کے نام سے موسوم کرتا ہے (الاسراء ۱۷: ۱۴)، عرفِ عام میں اسے رُوح (Soul)، اِگو (Ego)، انا (Self)، من، خودی وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ قلب، حواس، نفسِ امارہ اور نفسِ لوّامہ اس کے اعضا و جوارح ہیں۔



# قلبِ سلیم

یہ قرآن کی از بس اہم نفسیاتی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسا قلبی نظام جو اپنی اصل فطری حالت پر ہو۔ اور فطری حالت حسین ہوتی ہے (السجدة ۳۲: ۷)۔

حُسن کی تاثیر کی بدولت قلبِ حسین، مُنیر و مُطہّن ہوتا ہے۔ عقل چونکہ قلب (دل و دماغ) ہی کا ایک جزو لاینفک ہے، اس لیے وہ بھی حسین و مُنیر اور صحت مند ہوگی اور اپنا وظیفہ احسن و اکمل طریقے سے سرانجام دے گی۔

انسان کے باطنی (حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام) میں قلب مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اگر حسین و مُطہّن ہوگا تو عقل کے علاوہ نفس بھی مُطہّن ہوگا، اور مُطہّن نفوس ہی اہل جنت ہیں۔

(الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

★ یَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۚ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝

(الشعراء ۲۶: ۸۸-۸۹)



حساب و جزا کے دن نہ مال فائدہ دے گا اور نہ اولاد،  
بجز اس شخص کے جو قلبِ سلیم لے کر اللہ کے حضور  
آئے گا۔

اہلِ عقلِ سلیم کے لیے قرآنِ حکیم نے اُولوالالباب کی تعبیر بھی  
اختیار کی ہے (البقرہ ۲: ۲۶۹)۔



# قُوَّةٌ

القُوَّةُ کے معنی قدرت کے ہیں۔ یہ ضَعْف کی ضد ہے، خواہ جسمانی ہو یا عقلی۔ القُوْمِيُّ طاقتور اور قُوْتٌ والے کو کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسْنٰی میں سے ہے۔ قرآن حکیم نے اسے مندرجہ ذیل معانی میں استعمال کیا ہے :

## ۱۔ اللہ تعالیٰ کی قُوْت :

★ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿١١٠﴾ (سُورَةُ اَلْاٰنْ : ١١٠) :  
بے شک تمہارا پروردگار و آقا انتہائی قُوْت والا۔ سب پر غلبہ رکھنے والا ہے۔

## ۲۔ انسانوں کی قُوْت :

★ كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً  
(التَّوْبَةُ : ٩ : ٤٩) :  
جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں وہ قُوْت و سَطُوْت میں تم سے کہیں زیادہ تھے۔

## ۳۔ اسلحہ کی قُوَّت :

★ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ

الْخَيْلِ (الانفال ۸ : ۶۰) :

اور (مسلمانو!) دشمنوں کے مقابلے میں جہاں تک تمہارے بس میں ہو، تم قُوَّت یعنی دُور مار ہتھیار، اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے مضبوط گھوڑے (عصر حاضر میں بہترین ذرائع نقل و حرکت) تیار رکھو۔

(حدیث نبوی) دیکھو قُوَّة دُور مار ہتھیار ہیں؛ یاد رکھو قُوَّت دُور مار ہتھیار ہیں؛ خبردار رہو! قُوَّت دُور مار ہتھیار ہیں (رواہُ مُسلم، در المشکوٰۃ، باب اعدادِ اللہ الجہاد، ح ۳۶۸۳) (آج کے زمانے میں ہر قسم کا جدید اسلحہ یعنی بندوقب، توپیں، ٹینک، میزائل اور راکٹ وغیرہ وغیرہ دُور مار ہتھیاروں کے ذیل میں آئیں گے)۔

## علم کی قُوَّت :

★ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ ○ (الرحمن ۵۵ : ۳۳) :

(زمین و آسمان کی حدوں سے) تم سلطان یعنی علم کی قُوَّتِ  
تسخیر (= ٹیکنالوجی) کے بغیر نہیں نکل سکتے۔

# کُفْر

کُفر کے معانی ہیں : اللہ تعالیٰ اور اس کے نظامِ حیاتِ کُلّی، ملائکہ، کُتب و انبیاء، نیز آخرت کو تسلیم بالیقین کرنے سے انکار کرنا۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، انہیں ”دہریہ“ (Atheist) اور ان کے دستانِ فکر کو ”دہریت“ (Atheism) کہتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ

(الزخرف ۴۳ : ۳۰) :

اور جب اُن کے پاس الحق یعنی اللہ تعالیٰ کا سچا کلام آیا تو کہنے لگے کہ یہ سحر یعنی باطل کلام ہے، ہم اس کو نہیں مانتے۔

علاوہ ازیں، صراطِ مُستقیم یا جنت کی راہِ راست پر چلنے سے انکار بھی کُفر ہے۔

★ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كٰفِرًا ۝  
(الدّٰھر ۶۶: ۳) :

ہم نے (انسان کو) جنت کو جانے والا راستہ بتایا ہے،  
اب چاہے تو اسے اختیار کر لے، اور چاہے تو اس پر  
چلنے سے انکار کر دے۔

اسلام قبول کرنے یا اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود  
قرآن مجید کے بعض احکام کو تسلیم یا یقین یا تسلیم یا فعل نہ کرنا  
بھی کُفر ہے۔



# کُنْ فَيَكُونُ

”کُنْ“ صیغہ امر ہے، جس کا معنی ہے ”بن جا، یا ہو جا“ اور ”فَيَكُونُ“ اس حکم کی تعمیل ہے، یعنی وہ (چیز) بن جاتی ہے یا ہو جاتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ○

(یس ۳۶ : ۸۲) :

یہ اُس کی شانِ (قدرت) ہے کہ جب وہ کسی شے (کی تخلیق کرنے) کا ارادہ کرتا ہے تو اس چیز سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے یا بن جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ہے، یعنی کوئی چیز اس کے مثل یا مانند نہیں ہے، اسی طرح اُس کی ہر تخلیقی فعلیت بھی بے مثل و بے نظیر ہے؛ نیز اللہ تعالیٰ بے نیاز و بے احتیاج اور قادرِ مطلق و مُسَبِّبُ الْأَسْبَابِ ہے، لہذا اُس کے ”کُنْ“ کو

ہماری طرح حرف و صوت کی حاجت نہیں، لیکن اُس کی بے صوت و بے مثل آواز سے آفرینش کا سلسلہ جاری ہے اور کُل عواملِ ایک کیفِ سرمدی میں قائم و دائم بھی ہیں اور گردش میں بھی ہیں، اور اپنے اپنے وظائفِ حسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔

یہاں اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کُنْ جو امر یا حکم ہے، اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ کُنْ کہتا ہے یعنی حکم کرتا ہے کہ معرض وجود میں آجایا (ظاہر) ہو جا، وہ اس کے عالمِ علم میں موجود ہوتی ہے۔ احسن الخالقین جس شے کو کُنْ کہتا ہے، شے اسی لمحے اپنے ظہور کے لیے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ تخلیقی عمل سے گزرنا شروع ہو جاتی ہے، جسے قرآن حکیم نے ”فَيَكُونُ“ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سلسلہ روزِ آفرینش سے جاری ہے اور ابدالاً بادتک جاری رہے گا (الرحمن ۵۵ : ۲۹)۔

علامہ اقبال کا یہ شعر اسی واقعیت کا آئینہ دار ہے :

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید  
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُنْ فَيَكُونُ

”کُنْ فَيَكُونُ“ کی حقیقت ربِّ کریم کی تخلیقی فعلیت کے قانون کے مشاہدہِ بالحق سے واضح ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، کسانِ مزروعہ اراضی میں بیج ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ”کُن“ کہتا ہے تو بیج کی نشوونما کا سلسلہ بتدریج شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی مادہ کے رحم میں نطفہ پڑتا ہے تو وہ بحکم ”کُن“ فوراً ”بننا“ یا اپنی نشوونما پانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ عمل تیز و سبھی۔ ارتقائی ہوتا ہے۔





# لعنت

جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے یا دعوتِ ایمان کو حق تسلیم کرنے یا اس پر عمل کرنے سے انکار کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے، رحمت و مغفرت اور نصرت و ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے، نتیجتاً، اس کی جنت کے راستے یعنی صراطِ مستقیم سے دور ہو جاتا ہے۔ اس محرومی و دوری کو اصطلاحِ قرآنی میں لعنت، اور اس شخص یا قوم کو ملعون کہتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا

يُؤْمِنُونَ ۝ (البقرة ۲: ۸۸) :

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل و دماغ (علم و حکمت اور ایمان و حق کے) پردوں میں محفوظ ہیں (لہذا ان میں مزید علم و حکمت اور ایمان و حق کی گنجائش نہیں)۔ یہ بات نہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ ان کے انکارِ حق کے سبب (اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات نے) انہیں اللہ تعالیٰ کی

رحمت و مغفرت اور ہدایت سے محروم و دور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم اللہ تعالیٰ کے قوانین و احکام اور تعلیمات کو تسلیم یا یقین کرتے ہیں۔

آدم کی فضیلت کو تسلیم کر لینے کے حکمِ الہی سے انکار پر اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ابلیس کو یہی سزا دی تھی :

★ **وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ** ○ (الحجر ۱۵: ۳۵) :

اور بیشک اللہ تعالیٰ نے تجھ کو (یعنی ابلیس کو) جزا و سزا کے دن تک اپنی رحمت و مغفرت اور ہدایت سے محروم و دور کر دیا ہے۔



# مَاعُون

اس دُنیا میں زندگی کرنے کے لیے بُنیادی ضرورت کی اشیاء کو (جنہیں عام لوگوں تک پہنچانا حکومت اور معاشرے کی ذمّے داری ہے) اصطلاحِ قرآنی میں ”مَاعُون“ کہا گیا ہے۔ یہ ہر ضرورت مند کا حق ہے (حمّ السجدة ۴۱ : ۹-۱۰، المَعَارِج ۷۰ : ۲۴-۲۵) اور اس سِسٹم میں حائل ہونے والوں کو رِبِّ رِزَاقِ نَبِیِّنَ یَا اللّٰہُ تَعَالٰی کے نظامِ حیاتِ کُلّی کی تکذیب کرنے والوں میں شامل کیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ اَرۡءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبۡ بِالدِّیۡنِ ۙ فَاذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدۡعُۙ  
الۡیَتِیۡمَ ۙ وَلَا یَحۡضُ عَلٰی طَعَامِ الْمِسۡکِیۡنِ ۙ فَوَیۡلٌ  
لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنْ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۙ  
الَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ وَیَمۡنَعُوۡنَ الْمَاعُوۡنَ ۙ

(الماعون ۱۰۷ : ۱ تا ۷) :

غور کیا تم نے کہ دین کے احکام و تعلیمات اور عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کی تکذیب کون کرتا ہے ؟ وہی جو یتیم و بے یار و مددگار لوگوں کو (گلے سے لگانے کے بجائے) دھکے

دیتا ہے اور قومی کفالت کے انتظام کے لیے (حکومت اور معاشرے کو) ترغیب نہیں دیتا۔ تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو صلوٰۃ کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، جو ریاکاری کرتے ہیں اور بنیادی ضرورت کی اشیاء اہل احتیاج کو دینے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔



# مُنْفٰی

تقویٰ کا مادہ وقی ہے۔ یہ قرآن حکیم کی اہم ترین اصطلاحات میں سے ہے، جس کے معنی میں منفی و مثبت دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سِبَّیۡہ و نَسْر، باطل و کذب اور قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف اور حق و صداقت، رُشد و ہدایت اور رضائے الہی کی طلب و جستجو کی آرزو۔

منفی مفہوم : صراطِ مُستقیم سے بھٹک جانے کا ڈر اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

★ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ (المائدہ ۵: ۴) :

اللہ (کے قانونِ مکافاتِ عمل) سے ڈرتے رہو۔ یاد رکھو!

اللہ تعالیٰ اعمال کا صلہ فوری طور پر دینے والا ہے۔

مثبت مفہوم : رضائے الہی کی طلب و جستجو اور صراطِ

مُستقیم کی طرف رُشد و ہدایت کی آرزو۔

★ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۚ فِيهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝

(البقرہ ۲: ۲) :

یہ وہ کتاب ہے کہ اس میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ منتقیوں یعنی گمراہی کا ڈر اور ہدایت کی طلب و جستجو رکھنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

اس مصطلح قرآنی کی از بس اہمیت کے پیش نظر اب اسے ایک اور طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

منتقی کی مثال ایک ایسے طالب علم کی ہے، جسے علم کی سچی طلب ہو۔ اُسے تحصیل علم میں کامیابی کی آرزو بھی ہوتی ہے اور امتحان میں ناکام رہ جانے کا ڈر یا خوف بھی۔ بعینہ منتقی کو ہدایت یا اپنی حقیقی راہ و منزل کی آرزو و جستجو بھی ہوتی ہے اور گمراہ ہو جانے کا خوف بھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّيْتَهَا ۖ فَالْهَمَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۗ  
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۗ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۗ

(الشمس ۹۱: ۷-۱۰) :

اور شاہد ہے نفسِ انسانی اور وہ ذاتِ (اقدس) جس نے اُسے موزوں بنایا۔ پھر اُس میں حدود اللہ سے تجاوز کر جانے کا داعیہ اور آرزوئے ہدایت و خشیتِ گمراہی کا عرفان و ولایت کر دیا۔ یقیناً اُس نے خوف و حزن سے نجات

پائی، ترقی کی اور کامیاب ہوا جس نے نفس کی تطہیر و ربوبیت کی، اور وہ ناکام و نامراد ہوا جس نے اسے دباطل و کذب اور سیئہ و شر کے اثرات تلے دبا دیا۔

اس آیہ کریمہ میں فُجُورَہَا کو تَقْوَاہَا کے مقابل لاکر قرآن حکیم نے تقویٰ کی حقیقت کو اجاگر کر دیا کہ تقویٰ انسان کا فطری۔ نفسیاتی داعیہ ہے اور اس کی ضد فُجُور ہے۔ فُجُور کے معنی اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کر جانے اور صراطِ مُسْتَقِیْم پر گامزن رہنے کے بجائے ٹیڑھی تڑچھی راہیں اختیار کرنے کے ہیں۔ صاحبِ ارادہ و اختیار انسان اگر قبیح خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اُس کی آرزوئے ہدایت اور خوفِ گمراہی مُردہ ہو جاتی ہے اور وہ فُجُور میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ ثابت ہوا کہ قرآن حکیم کی رُو سے تقویٰ کے معنی ہدایت پانے یا صراطِ مُسْتَقِیْم پر چلنے کے نفسی داعیہ و آرزو اور گمراہ ہو جانے کے خوف کے ہیں۔

مُتَّقِی ہی ربِّ رحمن کے ہدایت یافتہ اور انعام یافتہ بندے ہوتے ہیں (الفاتحہ ۱: ۶-۷)۔

اللہ تعالیٰ کی عبادتِ کالِبِ لبابِ اِحیائے تقویٰ ہے

(البقرہ ۲: ۲۱، ۱۸۳)۔

# محکمات و متشابہات

محکمات سے مراد قرآن حکیم کی وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہے اور جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش ہی نہیں۔

مثال کے طور پر :

★ **أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ** ○ (الرعد ۱۳: ۲۸) :  
یاد رکھو! صرف اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

متشابہات سے مراد ایسی آیات ہیں جن کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے اور جنہیں بڑے عالم و فاضل ہی سمجھ سکتے ہیں، یعنی ان کو سمجھنے کے لیے وسیع علم کی ضرورت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام آدمی کو ایسی آیات کی تاویل بالترائے سے منع فرمایا ہے۔

کائنات میں اور کائنات کے وراء الوراہ بہت سے حقائق ایسے ہیں جن کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے وسیع علم کی ضرورت ہے، اور علم کا حصول ایک ارتقائی عمل ہے۔ یہ



حقیقتِ نفسِ الامری ہے کہ قرآنِ حکیم ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے سرچشمہٴ علم و ہدایت ہے، لہذا جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا جائے گا، انسان پر طبعی اور مابعد الطبعی حقائق کھلتے جائیں گے اور قرآن مجید کی متشابہات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

★ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ○ (آل عمران ۳ : ۷۰) :

وقف الہی  
وقف لازم

(اے نبی!) وہی ہے اللہ جس نے یہ عظیم کتاب آپ پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں ایک قسم تو ایسی آیات کی ہے جو محکمات ہیں اور اس کتاب کی اصل بنیاد ہیں۔ دوسری قسم متشابہات یعنی تمثیلی و تشبیہی قسم کی ہیں۔ جن لوگوں کے دل و دماغ میں کجی ہے، وہ ان آیات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو تمثیلی یا تشبیہی نوعیت کی ہیں۔

تاکہ فتنہ پیدا کریں؛ اور وہ اپنی رائے کے مطابق ان کی تاویل کریں، حالانکہ اس کی تاویل یا معنویت اللہ جانتا ہے اور وہ (جانتے ہیں) جو علم میں پختہ ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے کہ یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (متشابہات کو) وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و بصیرت والے ہیں۔



## مُخْلِص

قرآن حکیم کی رُو سے مُخْلِص اللہ کا وہ بندہ ہوتا ہے جو اپنے دل و دماغ کو کل غیر قرآنی اعتقادات و نظریات اور جذبات و تعصبات سے پاک و مُنَزَّہ کر کے اس عزمِ بِالْجَزْم کے ساتھ قرآن حکیم کو اپنا مُعَلِّم و مُرَشِد بنائے کہ وہ جو کئے گا میرے لیے حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے :

★ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَهُ

الدِّينِ ○ (الزُّمَرُ ۳۹ : ۲۲) :

(میرے نبی!) ہم نے آپ پر یہ کتاب حق (یعنی سچائی، عدل و توازن اور حکمت و مقصدیت) کے ساتھ نازل کی ہے، لہذا آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت (= اس کے احکام کی طاعت و بندگی) اس کے دین (اسلام) کے لیے مُخْلِص یعنی مُوَحِّد بن کر کرتے رہیں، دوسرے لفظوں میں غیر قرآنی اعتقادات کو ذہن سے نکال کر صرف قرآنی احکام کی طاعت و بندگی کرتے رہیں۔

یاد رہے کہ آدمی مُخْلِص ہو تو ابلیس بھی اسے بہکا نہیں سکتا (ص ۳۸ : ۸۳)۔

# معروف

یہ منکر کی ضد ہے اور قرآن حکیم کی بصیرت افزوز اصطلاح ہے جو عالمگیر صداقت (Universal Truth) پر دلالت کرتی ہے۔

المعروف ہر اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جس کی خوبی (جمالیاتی قدر = Aesthetic value) عقل یا شریعت کی رُو سے ثابت ہو۔ مثال کے طور پر، صداقت، امانت و دیانت، عدل و احسان، سخاوت و فیاضی، شجاعت اور حُسنِ خلق وغیرہ وغیرہ۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

★ الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ○ (التوبة: ۹: ۱۱۲):

عدل و احسان اور اصلاح و فلاح کے کام کرنے اور اللہ تعالیٰ کے احکام و تعلیمات پر عمل کرنے کا حکم کرنے والے اور سپیٹہ یا بُری باتوں سے منع کرنے والے، نیز اللہ کی مقرر کردہ حدوں کی حفاظت کرنے والے (یہی مؤمن لوگ ہیں) اور (اے نبی!) مؤمنوں کو (بہشت کی) خوشخبری سنا دو۔

”معروف“ ہر وہ شے، قول یا عمل ہے جو فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ، حسین اور قابلِ تحسین ہو۔

# مقامِ محمود

یہ عبودیت کا ایک ایسا ارفع و اعلیٰ مقام ہے، جس پر اللہ تعالیٰ (اپنے قانونِ انعام و فضل کی رُو سے) اپنے کسی بندے کو فائز کر دیتا ہے تو لوگ اس کے مکارمِ اخلاق، علم و حکمت اور زہد و تقویٰ کی تعریف میں رطبِ اللسان ہو جاتے ہیں۔  
اللہ سبحانہ و تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہیں:

★ عَسَىٰ اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ○ (الاسراء: ۱۷: ۷۹):

(پیارے نبی!) آپ کا پروردگار واقفا عنقریب آپ کو ایسے حسین و مکرم مقام پر متمکن کر دے گا کہ آپ کی مدح و ستائش ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

چنانچہ گزشتہ چودہ صدیوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل تعریف و ستائش ہو رہی ہے، جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، اور یہ تاریخی واقعیت قرآن حکیم کی الہامی پیش گوئی کی بربانِ قاطع ہے۔

# مُنَافِق

النَّفَقُ اُس گلی یا سُرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں مُنہ، راستے یا دہانے کھلے ہوں (لین)۔

قرآن حکیم کی رُو سے نفاق کے معنی دین کے معاملے میں دو رخی حکمتِ عملی یا پالیسی اختیار کرنے کے ہیں۔ مثال کے طور پر، مُنافق دکھاوے کے طور پر پنجگانہ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں، لیکن اُن کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ الغرض، وہ پورے کے پورے دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتے، یعنی اللہ تعالیٰ کے بعض احکام تو مانتے ہیں، بعض نہیں مانتے۔ وہ محض دکھاوے کے مُؤمن یا مُسلمان ہوتے ہیں، اور بلحاظِ ایمان آدھے تیز اور آدھے بٹیر ہوتے ہیں اور نظامِ اسلام میں پورے داخل نہیں ہوتے، بلکہ ”نیچے دروں نیچے بروں“ رہتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ  
بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ  
نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنْفِقِينَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝

(التوبة ۹: ۶۷):

مُنافِق مرد اور مُنافِق عورتیں ایک جیسے ہیں۔ مُنکرات کی طرف ترغیب دیتے ہیں اور حسنہ اور خیر کے کاموں سے روکتے ہیں اور (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے) مٹھی بند رکھتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا، یعنی نظر انداز کر دیا۔ بے شک مُنافِق فاسقوں میں سے ہیں، یعنی راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مُنافِق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے (النساء ۴: ۴۵)۔



# مُنْكَرٌ

یہ معروف کی ضد ہے۔

مُنْكَرٌ، ایک عالمگیر منفی و قبیح قدر (Universal negative and ugly)

value) ہے۔ مثال کے طور پر، جھوٹ، دغا بازی، بددیانتی، ظلم و استحصال، قبیح و سیئہ، بخل و بے حیائی، بد خلقی وغیرہ وغیرہ، جنہیں عقل سلیم اور جمالیاتی حس (Aesthetic Sense) جانتی ہیں کہ وہ منفی و قبیح قدریں ہیں، اس لیے انسان اُن سے نفرت کرتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ  
وَالْمُنْكَرِ (النور ۲۴: ۲۱) :

اور جو لوگ شیطان کے قدم پر قدم چلتے ہیں وہ انہیں بے حیائی و بخل اور منفی و قبیح باتوں کی ترغیب دیتا ہے۔

”مُنْكَرٌ“ ہر وہ شے، قول یا عمل ہے جو فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نہ ہو، بلکہ قبیح اور قابلِ نفرت ہو۔



# مؤمن

مؤمن کے لغوی معنی ہیں: امن کی ضمانت (Guaranty) دینے والا، جس پر اعتماد کر کے آدمی بے فکر اور خوف و خطر سے محفوظ ہو جائے۔

قرآن مجید کے اصطلاحی معنوں میں مؤمن وہ شخص ہے جو اللہ، یومِ آخر، فرشتوں، اللہ کی کتاب اور نبیوں کو تسلیم بالیقین کرے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے، اور اس سے وہ گمراہ ہو جاتا ہے (النساء ۴: ۱۳۶)۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

★ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمُ الْمُؤْمِنُ وَاللَّهُ  
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○ (التغابن ۶۴: ۲):

(اے بنی نوعِ انسان!) وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس نے درجہ بدرجہ ارتقائی انداز میں تمہاری تخلیق کی (اور تمہیں فکر و عمل کی آزادی دی)۔ پھر تم میں سے کوئی تو (اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے) کافر بن گئے اور کچھ (آزادی کا صحیح استعمال کر کے) اہل ایمان یعنی مؤمن بن گئے۔ اصل یہ ہے کہ جو اچھے یا بُرے کام تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کے علم و نظر میں ہوتے ہیں۔

# میثاق

یہ اصطلاح قرآنی ہے جسے قرآن حکیم نے عہد اور معاہدے کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے : عہد و پیمان کرنا، قول و قرار کرنا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ پکا عہد و پیمان (Covenant) کرنا۔

## اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان

★ الَّذِينَ يُؤْفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ○

(الرعد ۱۳: ۲۰) :

(جو اہل عقل سلیم ہیں) اللہ سے کیے گئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول و اقرار کو نہیں توڑتے۔

## آپس میں عہد و پیمان یا معاہدہ

★ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ (النساء ۴: ۹۰) :

جن لوگوں میں اور تم میں (جنگ نہ کرنے کا) معاہدہ ہو۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کر کے اُس کو توڑ ڈالتے ہیں، ان پر قرآن حکیم نے لعنت بھیجی ہے اور جہنم کی وعید دی ہے (الرعد ۱۳: ۲۵)۔

کلمہ طیبہ بھی ایک مِثَاق ہے جو ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے کہ وہ اُس کے سوا کسی اور کو الہ (یعنی محبوب و مطلوب اور حاکم و مطاع) اور رب نہیں بنائے گا اور نہ سمجھے گا، اور صرف اس کے احکام کے مطابق زندگی کرے گا۔



# نِفَاق

یہ ایک قلبی (یا نفسیاتی) بیماری ہے، جسے سرطانی بیماری کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ سرطانی اس لیے کہ یہ بیماری ایک تو جسمانی کینسر یا سرطان کی طرح مُہلک اور مجہول ہوتی ہے اور مریض کو اس وقت اپنے مرض کا پتہ چلتا ہے جب وہ اپنا ہلاکت آفریں کام کر چکنے کے بعد شدید درد دینے لگتا ہے؛ اسی طرح مُنافق کو بھی اس واقعیت کا شعور نہیں ہوتا کہ وہ مرضِ نفاق میں مُبتلا ہے، اور اُسے پتا اُس وقت چلے گا جب روزِ قیامت اس کے نتیجے میں عذاب میں مُبتلا ہو جائے گا۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝ يَخْدِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ لِيَمَّا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝ (البقرة ۲: ۸ تا ۱۰) :

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو صرف زبان سے کہتے

ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ مُؤمن نہیں ہیں۔ وہ (اس طرح) اللہ اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، مگر وہ اپنے آپ کے سوا کسی اور کو دھوکا نہیں دیتے، اور انہیں اس (اپنے نفاق) کا شعور (یعنی علم) نہیں ہے۔ اُن کے قلوب میں بیماری ہے، جسے اللہ (اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق) زیادہ کرتا رہتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

نفاق کا خاصہ کتمانِ حق، دروغ گوئی، فریب دہی اور خود فریبی ہے اور اس کا ایک سبب اللہ اور آخرت (یعنی یوم الدین) پر دل سے ایمان نہ لانا ہے۔



# نفس

یہ ایک از بس اہم اصطلاح ہے جسے قرآن حکیم نے متعدد معانی میں استعمال کیا ہے۔

۱۔ چھوٹی بڑی ہر سانس لینے والی ہستی کو قرآن حکیم ”نفس“ کہتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (الانبیاء ۲۱ : ۳۵) :  
ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

(نیز دیکھیں الانعام ۶ : ۹۹، السجدہ ۳۲ : ۱۷)۔

۲۔ نفس ایک نامیاتی کل (Organic whole) ہے۔ یہ ایک لطیفہ غیبی ہے جو لوگوں کے سینوں کے اندر واقع ہے۔ اسے ”انا“، ”ایغو“ (Ego)، ”من“ اور ”خودی“ (Self) وغیرہ وغیرہ کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے؛ قرآن حکیم اسے ”نفس“ سے تعبیر کرتا ہے۔  
ارشاد باری تعالیٰ ہے :

★ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝ (الاسراء، ۱۷: ۱۴):  
 تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔

(اور دیکھیے النحل ۱۶: ۱۱۱؛ القيمة ۵: ۱۴ و بمواضع  
 کثیرہ)۔

### ۳۔ نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ

نفسِ امارہ کا وظیفہ خواہشات و جذبات پیدا کرنا ہے  
 (یوسف ۱۲: ۵۳)؛ اس اعتبار سے یہ زندگی کرنے، نسل کشی  
 کرنے، علم و حکمت اور بہنرو فن سیکھنے اور مادی و معنوی  
 ترقی کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن شیطان کا وظیفہ یہ ہے کہ  
 وہ نفسِ امارہ کی خواہشات و جذبات کو ان کی فطری حدود  
 سے باہر لے جاتا ہے جس سے وہ قلیح بن جاتی ہیں (یوسف  
 ۱۲: ۵۳)؛ اور شیطان بہ رفاقتِ نفسِ امارہ، اپنی وسوسہ اندازی و  
 فریب کاری سے ان کو حسین و دلکش بنا کر دکھاتا رہتا ہے اور  
 نفسِ نکل کو ان کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتا اور تحریک کرتا رہتا  
 ہے (الانعام ۶: ۲۳)؛ اس پر نفسِ لوامہ ساتھ ساتھ نفسِ  
 امارہ کی ملامت کرتا رہتا ہے کہ وہ اس شیطانی حرکت سے

باز آجائے (یعنی نیکی اور بدی میں ستیزہ کاری جاری رہتی ہے) اور اگر وہ باز آجائے اور نفسِ لوامہ کافرمانبردار بن جائے تو انسانِ مسلمان و مؤجد اور صالح و مجاہدینِ کرجیاتِ طیبہ بسر کرنے لگ جاتا ہے۔ ایسے نفسِ کُلی (حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام اور جسم کا مرکب) کو قرآن حکیم "نفسِ مُطمئنّہ" سے تعبیر کرتا اور اُسے اہلِ جنت کہتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

★ يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّاتِي ۖ

(الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰):

اے نفسِ مُطمئنّہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، تو اُس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، لہذا تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

۲۔ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کے جی یاد دل کے لیے بھی اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

★ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ (المائدہ ۵: ۱۱۶):

(عیسیٰ کہیں گے کہ یا اللہ!) جو بات میرے نفس میں ہے وہ تو جانتا ہے اور جو تیرے نفس اور جی میں ہے میں اُسے نہیں جانتا۔



## نور

وہ پھیلنے والی روشنی جو چیزوں کو دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ قرآن مجید نے اسے اصطلاحاً درج ذیل معانی میں استعمال کیا ہے :

معروضی بصیرت افروز روشنی :

★ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ○ (المائدہ: ۵: ۱۵):  
تمہارے پاس اللہ کی طرف سے بصیرت افروز روشنی اور صاف صاف بیان کرنے والی کتاب آگئی ہے۔

اور

★ أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَكَ لِإِسْلَامٍ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ

رَبِّهِ (الزمر: ۳۹: ۲۲) :

کیا وہ شخص جس کا سینہ (حسی قلبی - نفسی نظام) اللہ نے دین اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور وہ اپنے رب کے قانون ہدایت کے مطابق علم کی روشنی میں ہو..... الخ

## مادّی اجسام کی روشنی :

★ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا ○

(یونس ۵: ۱۰) :

وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے سورج کو تابناک اور چاند کو درخشاں بنایا ہے۔

## معنوی نورِ ذات یا نورِ علم :

★ رَبَّنَا آتِنَا نُورًا وَاعْفِرْ لَنَا (التحریم ۶۶: ۸) :

اے ہمارے رب! ہمارے نور (ذات یا نورِ علم) کی ہمارے لیے تکمیل کر دے اور ہماری مغفرت فرما۔

اور

★ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ (التحریم

۶۶: ۸) :

اُن کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں جانب تیزی سے رواں دواں ہوگا۔

یہ نور دراصل ایمان و حُسنِ عمل، عقلِ سلیم و بصیرتِ قرآنی اور عشقِ الہی کا حاصل ہے جو اس دُنیا میں بصیرت بن کر راہ و

منزل دکھاتا ہے اور آخرت میں معروضی شکل اختیار کر کے اہل ایمان و آرزو کے آگے اور دائیں جانب رواں ہو کر جنتِ قُوسِ العین کی راہ دکھائے گا۔

النُّور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسنیٰ میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اس کے معنی روشنی دینے والے کے ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ باری تعالیٰ کی دیگر مخلوقات کی طرح ”نور“ بھی اس کی مخلوق ہے چنانچہ ارشاد ہوا :

★ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورِ (الانعام ۶: ۱) :

اور (اللہ تعالیٰ ہی نے) اندھیروں اور روشنی کو ایجاد کیا۔



## ہامان

یہ قرآن کی تلمیح (Historical Symbol) ہے، جس کی مختصراً  
صراحت کر دی جاتی ہے :

یہ علامت ہے فرعون کے مفاد پرست مشیروں، وزیروں،  
درباریوں، عہدیداروں اور ابن الوقت حامیوں کی۔ یہ فرعون کے  
پشتیبان ہوتے ہیں، اس کے نام پر حکومت کرتے، رعایا کے  
بُنیادی انسانی حقوق (Basic Human Rights) غصب و سلب  
اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔

ہمانیت کے معانی ہیں : اعیان حکومت یا بیوروکریسی  
اور عسکری ابطال۔



# ہبوطِ آدم

اِهْبِطُوا كَمَا مَطَّلَبُ هِيَ : مُنْتَقِلٌ هُوَ جَاؤُ بِأَجَلٍ جَاؤُ -

قرآن مجید میں ہے :

★ اِهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (البقرة ۲: ۶۱) :

(اے بنی اسرائیل!) کسی آبادی یا زرخیز شہر میں داخل

ہو جاؤ، وہاں جو تم مانگتے ہو تمہیں مل جائے گا (نتیجہ)

وہ ذلت (محکومی) اور محتاجی کا شکار ہو گئے۔

مثالی یا برگزیدہ انسان یا آدم سے بھول ہو گئی تو وہ استغفار و

توبہ کرتے رہے۔ ان کی توبہ قبول ہوئی تو ساتھ ہی انہیں بنی نوع

انسان کی ہدایت کے لیے نبوت سے سرفراز فرمایا گیا (آل عمران

۳: ۳۳)۔ انہوں نے وحی و تنزیل کے ذریعے لوگوں کو دین سے

آگاہ کیا اور ان کو مہذب و متمدن بنانے کے لیے من جملہ دیگر

علوم و فنون کے علاوہ فنِ زراعت بھی سکھایا۔ جب وہ زرعی و

معمائرتی زندگی کے قابل بن گئے اور ان کی آبادی بھی بڑھ گئی تو

انہیں ربُّ العالمین نے گھنے ثمرور باغِ دُنیا (جنت) سے نکل جانے اور میدانی علاقے میں زرعی زندگی کرنے کا حکم دیا۔

چنانچہ ارشاد ہوا :

★ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا (البقرة ۲: ۳۸) :

ہم نے حکم دیا کہ تم سب کے سب (یعنی آدم کے کُل رفقاءِ باغ) اس مقام سے نقل مکانی کر جاؤ۔



## ہدایت

اس اصطلاحِ قرآنی کا مطلب انسان کی آخری منزل، جنت اور اس کی آخری تمنا، اللہِ جمیل و ربِّ رحمن کی فطری و حسین شاہراہ کو پانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بناء پر اپنی آخری الہامی کتاب، قرآن حکیم کو ”الْهُدَىٰ“ سے تعبیر کیا ہے (البقرة ۲: ۱۸۵، و بمواضع کثیرہ)، جو متقیوں یعنی اہل آرزو و خشیت پر جنت کو لے جانے والی حسین شاہراہ کھول دیتا ہے۔

ہدایت صرف وہی ہے جو قرآن حکیم دیتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

★ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ (البقرة ۲: ۱۲۰):

(اے نبی!) کہہ دیجیے کہ اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے۔

قرآن حکیم کے علاوہ کوئی اور ہدایت، حقیقت میں، ہدایت نہیں، کیونکہ وہ انسان کو صراطِ مستقیم دکھاتی ہے نہ اُسے اُس کی آخری منزل مقصود پر ہی پہنچاتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی جنتِ قسۃ العین اور انسان کا حُسن المآب ہے۔ حُسن المآب کی قرآنی اصطلاح کا مطلب ہے: حُسن و سُور سے معمور ابدی گھر، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندوں کے لیے بنایا ہے۔

## هُوَ

اس کے لفظی معنی ہیں ”وہ“۔ یہ اصطلاحِ قرآنی اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ زندہ بالذات، قائم بالذات، یکتا و منفرد ہے اور کوئی شے اس کے مثل نہیں، لہذا فقط اللہ تعالیٰ ہی انسان سمیت کل مخلوقات کا الہ یا معبود اور حاکم و مطاع ہے، اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے ہُو صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ یکتا پر دلالت کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

★ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (الحشر ۵۹: ۲۳) :

”وہ“ اللہ ہی ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود و محبوب، مقصود و مطلوب اور حاکم و مطاع نہیں۔

اس لحاظ سے یا قرآن مجید کی رو سے، اللہ تعالیٰ یا ”هُوَ“ کے لیے واجب الوجود کی صوفیانہ اصطلاح استعمال کرنا ناجائز، ناروا اور غلط ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اگر ہُو کا مطلب واجب الوجود ہو تو اللہ مادی وجود کے مثل ہوا، حالانکہ قرآن مجید کی رو سے کوئی چیز اس کے مثل نہیں (لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ - الشوریٰ ۴۲: ۱۱)۔



# یقین

ایقین کے معنی کسی امر کو پوری طرح سمجھ لینے کے ساتھ اس کے پائیدار ثبوت تک پہنچ جانے کے ہیں۔ قرآن حکیم کی رو سے اس کے تین درجات ہیں :

۱۔ علمُ الیقین : علم کے ذریعے کسی بات کو سمجھ لینا۔

★ كَلَّا لَوْ تَعْمَلُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ (التكاثر ۱۰۲ : ۵) :

یقیناً وہ علم کے ذریعے جان لیں گے۔

۲۔ عَمِنَ الْيَقِينِ یا یقین بالمشاہدہ ، یعنی کسی چیز کو دیکھ کر اُسے تسلیم بالیقین کرنا۔

★ ثُمَّ لَتَرَوْهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝ (التكاثر ۱۰۲ : ۷) :

پھر تم ضرور بالضرور اُسے آنکھ سے بھی دیکھ کر یقین کر لو گے۔

۳۔ حَقُّ الْيَقِينِ : یقین کا کامل ترین مقام ہے۔ اس میں علم بالحق ، مشاہدہ بالحق اور احساس بالحق

تینوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

★ إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ○ (الواقعہ ۵۶: ۹۵):  
یقیناً (جہنم میں داخل کیا جانا) محسوس طور پر یقینی ہوگا۔



# یوم

یہ وسیع المعانی اصطلاح ہے۔ قرآن حکیم نے اسے اپنے  
 ایجازِ بلاغت سے ایک لحظے سے لے کر پچاس ہزار برس  
 کے لیے بھی ”یوم“ کی تعبیر کے طور پر اختیار کیا ہے اور غیر مُعَيَّنہ مُدَّت  
 کے لیے بھی۔ مثلاً

یوم، ایک لحظے کے لیے :

★ كَلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرَّحْمٰنُ ۵۵ : ۲۹) :  
 ”وہ“ ہر آن یا لمحے تخلیقی فعلیت میں رہتا ہے۔

وقت کے لیے :

★ وَسَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُرْجَعُ

حَيًّا (مَرْيَمُ ۱۹ : ۱۵) :

یقیناً بوقتِ ولادت اُس (عیسیٰ) پر سلامتی تھی اور  
 بوقتِ موت بھی، اور اُس وقت بھی اُس پر سلامتی  
 ہوگی جب اُس کی نشأۃ ثانیہ ہوگی، یعنی روزِ قیامت

جب اُسے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

## ایک دن کے لیے

★ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيّٰمٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ  
يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ (البقرة ۲: ۲۰۳):

اور (قیامِ منیٰ کے) معدودے چند دنوں (یعنی گیارہ،  
بارہ اور تیرہ ذی الحجہ) میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ  
اور احکام و عقائدِ جلیلہ و محسّسہ کا (کثرت سے) تذکرہ  
کرتے رہو۔ پھر جو کوئی منیٰ میں دو دن ٹھہرنے کے بعد  
(مناسک ادا کر کے) وہاں سے رخصت ہونے میں  
جلدی کرے تو اُسے کوئی گناہ نہ ہوگا۔

## ایک ہزار برس کے لیے

★ ثُمَّ يَخْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا  
تَعُدُّوْنَ ۝ (السجده ۳۲: ۵):

(اللہ تعالیٰ، اپنے قوانینِ تدبیری و حکمت کے مطابق  
آسمان سے زمین تک کے کُل امور کا انتظام کرتا ہے)  
پھر وہ ایک یوم یا دن میں جس کی مقدار تمہارے حساب

سے ایک ہزار برس ہے، اُس کی طرف رجوع کریں گے۔

پچاس ہزار برس کے لیے

★ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ

خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (المعارج، ۴۰: ۴۲) :

فرشتے اور رُوح ایک یوم میں، جس کی مقدار تمہارے  
حساب سے) پچاس ہزار برس ہوگی، اس کی طرف  
چڑھتے ہیں۔

ارضی و سماوی گروں کی تخلیق سے پہلے کے  
غیر مُعینہ عرصہ دراز کے لیے :

★ إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ

أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأُمْرَ (يونس: ۳) :

(یاد رکھو!) بیشک تمہارا پروردگار اللہ ہے، جس نے آسمانوں

اور زمین کی تخلیق (ارتقائی انداز میں مرحلہ وار) چھ

ادوار میں کی، پھر وہ تختِ فرماں روائی پر جلوہ افروز

ہو گیا اور اپنے امور کو حکیمانہ انداز میں سرانجام دیتا ہے۔



# یومِ الدین

اس کے لغوی معنی ہیں : روزِ جزا، لیکن اصطلاحِ قرآنی میں اس کے معانی ہیں : کُل بنی نوعِ انسان کے دوبارہ زندہ ہونے، اپنے اعمال کا حساب دینے اور ان کے حُسن و قبح کے مطابق اجر لینے کا روز۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ سے متعلق بتایا ہے کہ وہ

★ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ○ (الفاتحہ ۱: ۳) :

روزِ حساب و جزا کا مالک ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ روزِ حساب و جزا کا بلا شکرکتِ غیرے حاکمِ مُطلق ہے۔ اُس کے فیصلے میں کسی کو چُون و چِرا کرنے یا عمل و خل دینے کا اختیار نہ ہوگا۔ جس وقت ساعتِ مُنتظر (Zero Hour) آئے گی تو کائنات تہ و بالا ہو جائے گی۔ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو جائے گا (القارعہ ۱۰: ۵)۔ اَحْسَنُ الْخَالِقِينَ اسے طُومار کی طرح لپیٹ لیں گے۔ اس کے بعد تخلیقِ اَوَّل کی طرح اس کی

پھر تخلیق نو کریں گے (الانبیاء ۲۱ : ۱۰۴)۔

قیامت کے روز جملہ افراد نسلِ انسانی دوبارہ زندہ کیے جائیں گے تو اللہ جل شانہ ان کے اعمال کا حساب لے گا۔

جس شخص کی حسنات یا نیکیاں تعداد اور وزن میں زیادہ ہوں گی وہ جنت میں جائے گا، بخلاف اس کے، جس شخص کی سیئات یا بدیاں تعداد اور وزن میں زیادہ ہوں گی وہ دوزخ میں جائے گا۔

ارشاد ہوتا ہے :

★ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۖ  
وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۖ وَمَا  
أَدْرَاكَ مَا هِيَةٌ ۖ نَارٌ حَامِيَةٌ ۖ (الفارغہ ۱۰۱ : ۱۰۴) :

جس شخص کے اعمالِ صالحہ کے ثمرات یعنی حسنات کا وزن بھاری ہوگا، وہ سرورِ بداماں زندگی کرے گا، اور جس کی حسنات وزن میں نسبتاً ہلکی ہوں گی، وہ ہاویہ یا آغوشِ جہنم میں ہوگا، تم اس کی ماہیت کو کیا سمجھ سکتے ہو، وہ آتشِ فروزاں ہے۔





# مطالعات قرآن

کے معانی و مطالب کا مفرد و جامع لغات

خواجہ مخدوم محمد اسلم

